آصف فرّخی

چیزیں اور لوگ

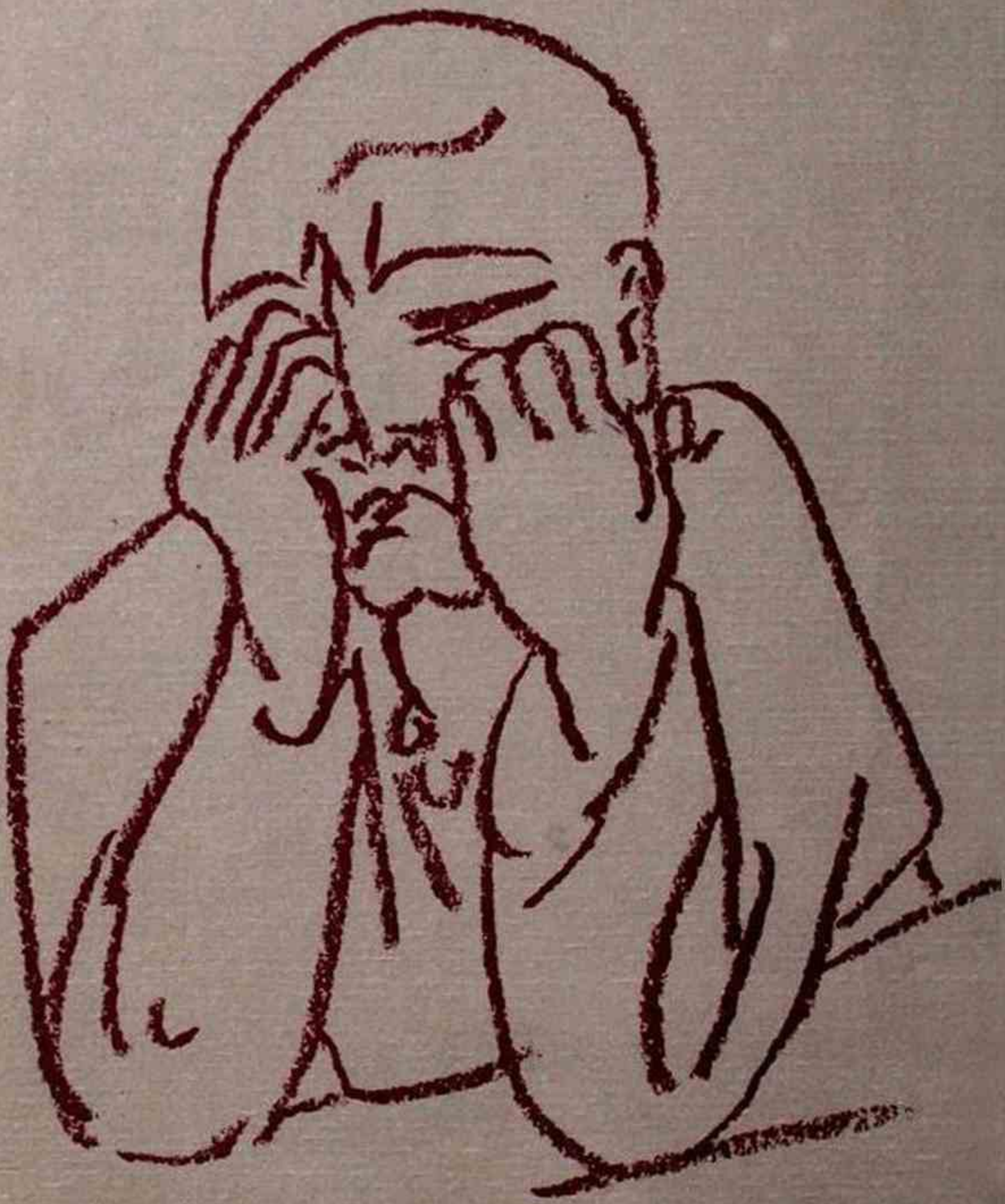

آصف فرّخی

۱۹۵۹ء میں کراچی میں پیدا ہوئے
اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔
اعلیٰ تعلیم کراچی اور ہارورڈ یونیورسٹی
(امریکہ) سے حاصل کی۔ پیشے کے اعتبار
سے ڈاکٹر ہیں۔

پہلا افسانہ ۱۹۷۸ء میں لکھا۔ افسانوں
کا پہلا مجموعہ ۱۹۸۲ء میں اور دوسرا
۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ متعدد نظمیں
مضامین اور تراجم شائع ہو چکے ہیں۔
افسانوں کا ایک مجموعہ اور مضامین کا مجموعہ
زیرِ ترتیب ہیں۔

www.taemeernews.com

چیزیں اور لوگ

(افسانے)

آصف فرّخی

احسن مطبوعات

www.taemeernews.com

جملہ حقوق محفوظ

ضابطہ

اشاعتِ اوّل : مارچ ۱۹۹۱ء

سرورق :

کمپوزنگ : پبلشرز یونائیٹڈ

طابع : مشہور پریس کراچی

قیمت : سو روپے

احسن مطبوعات

بی ۱۵۵ ، بلاک ۵، گلشنِ اقبال، کراچی ۴۷

www.taemeernews.com

غزل کے لیے

www.taemeernews.com

'Everything in life that happens to me has a sense beyond itself, means something, that life in its day to day events speaks to us about itself, that it gradually reveals a secret, that it takes a form of a rebus whose message must be deciphered, that the stories we live in life comprise the mythology of our lives and in that mythology lies the key to truth and mystery. Is it all an illusion? Possibly, even probably, but I can't seem to rid myself of the need to decipher my life continually.'

Milan Kundera, 'The Joke'. Pages 140-141.

www.taemeernews.com

فہرست

۱- زمین کی نشانیاں	10
۲- بحیرۂ مردار	18
۳- ستارۂ غیب	30
۴- جونک	40
۵- سمندر	49
۶- دیمک	68
۷- کاگ داس	82

www.taemeernews.com

۸- من شر ما خلق 96

۹- کاغذِ آتش دیدہ 112

۱۰- زرخیز 120

۱۱- قلزم 130

۱۲- آٹے کی آپا 140

۱۳- اوپر والیاں 167

۱۴- گائے کھائے گڑ 174

۱۵- بیر بساون 178

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

زمین کی نشانیاں

www.taemeernews.com

*

گھر کے راستے پر جاتے جاتے میں ٹھٹھکا تھا۔ وہ راستہ اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ قدم خود بخود اٹھ جاتے تھے۔ لیکن آج کوئی چیز بدلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ "ادھر رکوانا" میں نے ویگن کے کنڈیکٹر سے کہا تھا، اسی طرح جیسے پچھلے کئی سال سے کہتا چلا آیا تھا۔ ایک خاص نشانی کے بعد اپنی سیٹ چھوڑ دینا، دروازے پر آ جانا، ویگن رکوانا، اترنا اور اسی طرف چل دینا، یہ سب کچھ ایک طے شدہ رسم بن چکا تھا جو پوری طرح سے میری شمولیت کے بغیر بھی انجام پاتی رہتی تھی۔ اتر کر میں اس طرف جانے لگا مگر ایک خلش سی ہو رہی تھی کہ یوں نہیں ہے، کسی اور طرح ہونا چاہیے جو نہیں ہو رہا ہے۔ جب تک مجھے پتہ نہیں چلے گا کہ غلطی کیا ہے، میں صحیح کیسے کروں گا، میں پریشان ہونے لگا۔ وہاں سے گھر نظر آ رہا تھا، دوپہر کے سناٹے میں کھویا ہوا، گیٹ کے سامنے لگے ہوئے گل مہر میں دھوپ اور سائے لپٹے ہوئے تھے۔ گیٹ کے سامنے میرا کمرہ تھا۔ مگر اب وہ میرا نہیں تھا۔ تب مجھے یاد آیا آج مجھے ان نشانیوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم یہ جگہ چھوڑ چکے تھے۔ اب ہم دوسرے مکان میں رہتے ہیں۔

وہ ان مکانوں میں سے کوئی سا بھی ہو سکتا تھا۔ سب ایک جیسے تھے۔ گلی میں داخل ہوتے ہی بلی کی آواز آئی۔ وہ ابھی تک گئی نہیں، میں نے سوچا۔ یہ درخت اور دیواریں میرے لیے نئے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے اس منظر کی خاموشی کا حصہ تھے۔ میرا وجود ان کے لیے نیا اور اجنبی تھا۔ برگد کی پھیلی ہوئی جڑوں کی وجہ سے سڑک کا اتنا حصہ اوپر اٹھ آیا تھا۔ اس پر سے میرا پیر کئی دفعہ مڑ چکا تھا۔ ابھی اس کی عادت نہیں پڑی تھی۔ سینبھل کا پیڑ مکان کی چھت سے اونچا اٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

کسی اجنبی جگہ پر مجھے نیند نہیں آتی۔ میں ریل میں یا سفر کے دوران نہیں سو سکتا۔ نیند اس وقت آتی ہے جب چاروں طرف مانوس در و دیوار ہوں۔ میں دو راتوں سے جاگ رہا تھا۔ آنکھ لگنے بھی نہ پاتی کہ نیند اچٹ جاتی۔ میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور رات بھر وہ بلی نحوست زدہ آواز میں روتی رہی۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ لان کے کس حصے میں رو رہی ہے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی اسے مار کر بھگا دیتا۔ اصل میں اس مکان کے سایوں اور سرگوشیوں سے میری دوستی نہیں ہوئی تھی۔

ہم نے اس بلی کو نہیں پالا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمیں اپنا چکی ہے۔ شاید ہم اس کے پالتو انسان بن چکے تھے۔ ہم نے اسے آتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے ہی دن جب مکان خالی پڑا تھا اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ان کمروں میں سامان کس ترتیب سے جمائیں گے اور یہاں ہماری زندگی کیسی ہوگی، اس وقت وہ ایک ایک کمرے میں بھٹکتی، میاؤں میاؤں کرتی پھر رہی

www.taemeernews.com

تھی۔ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈ رہی تھی جو وہاں نہیں تھی۔ سامان اٹھا کر اندر لانے والوں کے پیروں میں کئی دفعہ آئی اور الجھی۔ سارا سامان لان میں رکھا ہوا تھا، بے ترتیب ڈھیر جس میں اشیاء اپنی افادیت اور ہیئت سے الگ ہو کر گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ وہ ان صوفوں پر بیٹھ گئی جو کسی تباہ شدہ شہر کا ملبہ معلوم ہو رہے تھے یا کسی اور زمانے سے بھٹکی ہوئی مخلوق۔ میں نے اسے چپل کھینچ کر ماری، مگر اس نے بے نیازی سے منہ پھاڑ کر جمائی لی اور وہیں بیٹھی رہی۔

وہ مسافرت کے دن تھے جو ہم نے اس گھر میں گذارے۔ نہ کھانے پکانے کا ٹھکانا نہ اٹھنے بیٹھنے کا۔ گھر کی اجنبیت کم نہ ہوئی تھی۔ نظریں کسی نہ کسی ایسی چیز پر پڑ جاتیں تو وہ عجیب سی لگتی۔ یا وہ بے جگہ تھی یا ہم۔ مکان کی تنہائی ہم سے آباد نہ ہو سکی تھی۔ باہر نکلتے تو خیال آتا کہ یہاں سے اب گھر جائیں گے، اور اندر آتے تو ہاتھ اور دروازہ ایک دوسرے کے لمس پر چونک پڑتے۔

اتنے دن بلّی نظر نہیں آئی، لیکن راتوں کو لان میں روتی رہتی، میاؤں میاؤں کرتی گھومتی رہتی۔ رات کے اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی آواز۔

پھر جب ہم کچھ سیٹل ہو گئے تو بلّی دوبارہ نمودار ہوئی۔ ہم میز کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میز کے دائیں طرف کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی میں نظر آئی۔ وہ مچھلی کی بو سونگھ کر آئی تھی۔ اور وحشی درندے کی طرح خوراک میں سے اپنا حصہ طلب کر رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میز پر ظہیر کے لیے جگہ خالی تھی۔ اس کے لیے پلیٹ اور گلاس رکھے تھے۔ پلیٹ خالی تھی، گلاس میں کسی نے پانی بھر دیا تھا۔ ہم خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ لگتا تھا وہ جالی پھاڑ دے گی۔ میز پر کود جائے گی۔ پلیٹیں، ڈونگے، چمچے، گلاس درہم برہم کر دے گی۔

میرے الٹے ہاتھ پر کرسی خالی تھی۔ وہ گلاس اور پلیٹ اس کے سامنے لگے ہوئے تھے۔ اس پلیٹ میں میں نے مچھلی کی ہڈی نکادی۔ یہ بلّی کے آگے ڈال دوں گا۔

"اس پلیٹ میں کیوں رکھ دی؟ یہ کوئی بے کار ہے؟" امی نے کہا۔ ان کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

ابا نے کچھ نہیں کہا۔ ان کی نظریں نہ حمایت میں اٹھیں نہ مخالفت میں۔

مچھلی کے ٹکڑے میں نے بلّی کے آگے نہیں ڈالے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک کمرہ میرا تھا۔ وہاں میں اپنی ساری چیزوں کو اپنے آپ سے ہم آہنگ محسوس کر سکتا تھا۔ ایک کمرہ ظہیر کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کی ہر چیز اسی طرح رکھی تھی جیسے وہ خود پسند کرتا تھا۔ اس مکان میں ہم سب کے لیے کمرے تھے۔ پہلے ظہیر میں اور ببوا ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ببوا نے الگ کمرے پر بہت واویلا مچایا تھا۔ "ہم ہمیشہ بھرے گھر میں رہے ہیں۔ ہم ایک کونے میں کیوں پڑ رہیں؟" یہ مشترکہ خاندان کے زمانے کی ہیں، پرائیویسی کا لفظ ان کی لغت میں نہیں موجود،

www.taemeernews.com

میں نے سوچا۔ یہ اصطلاحیں میں نے چند دن پہلے کسی کتاب میں پڑھی تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسی باتیں اس زندگی پر بھی ٹھیک بیٹھ سکتی ہیں جو ہم روز گذارتے ہیں۔

ٹیلی فون کے کھمبے پر مینا کا گھونسلا تھا۔ بالکل سیدھا تھا۔ ظہیر نے کہا تھا اس پر ٹیلیفون ٹھیک کرنے والا بندر کی طرح چڑھ جاتا ہے۔ اس وقت ہم اس چھوٹی سی بات پر کتنا ہنسے تھے۔ اب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی زیادہ رلاتی ہیں۔ اس کھمبے کے نیچے بلّی کتنے چکر کاٹتی، اور بلّی کو آتا دیکھ کر مینا زور زور سے بولنے لگتی۔

رات کو بلّی کوڑے کے کنستر میں گھس جاتی۔ ہم اس کے لیے سوکھی روٹی یا چھیچھڑے ڈال دیتے، تو انہیں منہ نہ لگاتی۔ صبح کے وقت کنستر الٹا ہوا ملتا اور موتیے کی کیاری میں توس کے کنارے، چائے کی پتی، مچھر مار جلیبی کے ٹکڑے اور ردّی کاغذ بکھرے ہوئے ہوتے۔ اگلی رات میں نے کنستر کے ڈھکنے پر پتھر رکھ دیا، مگر آدھی رات کے بعد کنستر کے لڑھکنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیرے میں کنستر یوں لوٹ رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں درد قولنج اٹھا ہو۔ ایک دن بارش ہوئی تو وہ کیچڑ میں لت پت آن کر برآمدے میں رکھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ برآمدے کے چکنے ٹائلز پر کیچڑ بھرے بلّی کے پنجے بنے ہوئے تھے۔

اس نے پنجے مار مار کر گدے اور کشن پھاڑ دیے۔ ایک دن وہاں سے بدبو آنے لگی۔ ناک پر رومال رکھ کر دیکھا تو اس نے وہاں گندگی کی ہوئی تھی۔

شام کے وقت باورچی خانے میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ جوش کر کے رکھ دیا گیا تھا تاکہ ٹھنڈا ہو جائے تو ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ اور دودھ ڈھکا ہوا ہو تو ملائی کی تہہ نہیں جمتی۔ امی کو خیال ہوا کہ اس میں بلّی نے منہ ڈال دیا ہے۔ اسے ایسا کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، مگر انہیں یہ وہم ہو گیا تھا۔ بلّی کا جھوٹا دودھ کیا ہوتا، نالی میں بہا دیا گیا۔ بلّی کھانے کے وقت کھڑکی میں روز آجاتی اور جالی کے باہر سے میاؤں میاؤں کیے جاتی۔ اس کی آواز گھنٹی بڑھتی رہتی۔ کبھی اس میں درخواست ہوتی، کبھی جھنجھلاہٹ، کبھی دھمکی۔ اس کی آسیب زدہ موجودگی کی وجہ سے کھانا دشوار ہو جاتا۔

"یہ بلّی ان لوگوں کی ہے" امی نے کہا۔ اس مکان کا ایک ماضی تھا۔ بلّی اس میں سے آئی تھی۔

"بلّی اپنی جگہ نہیں چھوڑتی" ابا کہنے لگے۔ "کتے لوگوں سے مانوس ہوتے ہیں، مگر بلّی کی اُنسیت گھر سے ہوتی ہے۔ بلّیاں ہجرت نہیں کرتیں۔ گھر والے چلے بھی جائیں تب بھی وہیں لوٹ کر آتی رہتی ہیں۔"

ظہیر کو کلیجی کتنی پسند تھی۔ اس دن امی نے کلیجی دھو کر بیسن دانی کے پاس رکھی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ شاید پیچھے کا دروازہ پورا بند نہیں ہو پایا۔ پچھلے دروازے سے لے کر

www.taemeernews.com

گیٹ تک گوشت کا لال لال پانی، سرخ پنجوں کے نشان اور کلیجی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا یہاں کسی کا قتل ہو گیا ہے۔

"ہمارے ہاں حویلی میں بڑا جغادری بلّا آتا تھا"۔ رات کو بوا نے کہنا شروع کیا۔ "نانا میاں اپنے کبوتروں کا بڑا لڑیت کرتے تھے۔ جب سے بلّا ان کا شیرازی کبوتر لے کر بھاگا تھا، تب سے تاک میں رہتے تھے۔ انہوں نے یہ بڑا لوہے کا جال بنوایا، بھول بھلیاں کی طرح کا، جس میں اندر جانے کا راستہ رکھا مگر باہر نکلنے کا نہیں۔ اور اس میں سینکڑوں بلّیاں پکڑیں"۔

"بلّی کو مارنے سے بہت گناہ ملتا ہے"۔ امی نے کہا تھا۔

مگر اس دن ایک پرانا لحاف ڈال کر بلّی کو پکڑوایا گیا اور اسے بوری میں بند کر دیا گیا۔ بوری کے منہ پر سُتلی میں نے باندھی تھی۔ جس وقت بلّی کی بوری لوکل ٹرین میں لے جا کر رکھی ہے تو بوری ہل رہی تھی۔ میں اگلے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

بلّی کے ریل میں چڑھوا دیے جانے کے دو دن بعد امی کو پیڑ کٹوانے کا خیال آیا۔ خیال تو پہلے سے آیا ہوگا، ہم سے دو دن بعد کہا۔ بہت بڑا درخت تھا، سارے گھر پر چھایا ہوا۔ دن کے وقت بھی پورے مکان پر اس کی چھاؤں رہتی۔ شام ہوئے تک اس کے سوکھے پتّے لان پر پھیلے ہوتے۔ اس کا ایک بڑا سا تنا کھلے ہوئے ہاتھ کی طرح چھت پر پھیلا ہوا تھا۔

"اس کی وجہ سے لان پر بہت کوڑا ہوتا ہے" امی نے شروع میں کہا تھا۔ "پتّے اتنے جمع ہو جاتے ہیں کہ لان کو صاف رکھنا بہت مشکل ہے۔"

امی کا وہ روایتی دست سبز تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتیں ہری بھری ہو جاتی۔ وہ باغ میں پودے لگاتی تھیں اور ان میں پھول آنے لگتے۔ ہمارے پچھلے گھر میں پھل بھی بہت تھے، مگر ان میں کیڑا لگ گیا تھا۔ جب ہم نے وہ گھر چھوڑا ہے تو پورے پورے پھل سڑ کے پھنک جاتے۔ اوپر سے بالکل اچھے، مگر اندر کا پورا گودا کرکھایا ہوا۔ کئی پیڑوں کو اندر ہی اندر گھن کھا رہا تھا، اور ہمیں پتہ تک نہ تھا۔

دن بھر کتنی بہت سی چڑیاں اس میں چھپی رہتیں۔ یوں لگتا کہ پتّے بول رہے ہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جب اس میں سے روئی کے گالے اُڑیں تو انہیں تتلیوں کی طرح پکڑ کر جمع کر لوں اور اپنے تکیے میں بھر دوں۔ بوا بتاتی تھیں کہ سینبل کا تکیہ بہت نرم ہوتا ہے اور اس پر نیند بھی چین کی آتی ہے۔ جب موسم آئے گا تو اس کے پتّے جھڑ جائیں گے۔ ننگی شاخیں رہ جائیں گی۔ پھر کلیاں پھوٹیں گی، اتنی موٹی موٹی، گوبڑے کی طرح، اور ان سے سرخ پھول بن جائے گا۔ بے حد سرخ۔ سارا پیڑ بھبھو کا ہو جائے گا۔ اور جب پھول سوکھ کر کالے ہو جائیں گے، جمے ہوئے خون کے کھرنڈ کی طرح، تو ڈوڈے پھٹ جائیں گے۔ اور روئی نکل کر اڑنے لگے گی۔

سامنے والی بیگم ہاشمی ایک دن ہمارے ہاں سے منی پلانٹ چرانے آئیں۔ انہوں نے امی کو

www.taemeernews.com

بتادیا تھا کہ وہ اس بیل کی ڈنڈی توڑ کر لے جائیں گی۔ سینبل کے پیڑ پر منی پلانٹ کے چوڑے پتے پھیلے ہوئے تھے۔ پیلے اور ہرے پتے۔ "اگر اسے چرایا نہ جائے تو بات نہیں بنتی"، بیگم ہاشمی نے کہا۔ "یہ جس گھر میں چل نکلے، اس گھر میں پیسے بہت آتے ہیں۔ یہ اس کا اثر ہوتا ہے۔" وہ کہنے لگیں کہ یہ ان ڈور پلانٹ ہے، اسے ڈرائنگ روم میں کسی گملے یا بوتل میں لگائیں، دھوپ اور گرمی میں نہ چھوڑیں۔ "پودے کا خیال رکھیں۔ گھر میں روپے کی ریل پیل ہوجائے گی"۔ انہوں نے امی کو بتایا کہ ہم ہر سال اپنا پیڑ ٹھیکے پر دے دیتے ہیں۔ ایک آدمی آکر ڈوڈے توڑ لے جاتا ہے۔ دن بھر میں پورا پیڑ خالی کر دیتا ہے ورنہ اگر روئی اڑ جائے تو جمع کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

جب روئی اڑتی ہے تب اصل مصیبت شروع ہوتی ہے، دوسرے پڑوسی نے بتایا۔ ان کی اور ہماری دیوار بیچ تھی۔ روئی اڑاڑ کر اندر آتی ہے۔ ہر چیز میں گھس جاتی ہے، کھانے کی چیزوں میں گر جاتی ہے، کوئی چیز کھلی نہیں چھوڑ سکتے، صوفے اور قالین میں پر جاتی ہے اور اس کا صاف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لان کی ساری گھاس میں مل جاتی ہے، رات کو اوس پڑنے سے چپک جاتی ہے اور صبح کو سوکھ کر کھڑنک ہوجاتی ہے، سارا لان خراب ہوجاتا ہے۔

گھر میں روئی اتنی آتی ہے اور سانس کے ساتھ جاتی ہے، اس سے دمہ ہوجاتا ہے۔ کونے کے مکان والے ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔ ان کو زکام ہو رہا تھا۔ ہم نے بھی اپنا پیڑ کٹوا دیا تھا، وہ بتانے لگے۔ کاٹنے کے بعد اتنا سا ٹھنٹھ رہ گیا تھا۔ اس میں سے ہری ہری شاخیں پھوٹ آتی تھیں۔ اور اتنی تیزی سے بڑھنے لگیں، جیسے وہ انتقام کے طور پر اگ رہی ہوں۔ ہم نے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا، تار کول جلایا اور اس کی جڑوں میں پاؤ بھر افیم پانی میں گھول کر ڈالی۔ اس کا جتنا حصہ زمین کے اوپر ہے، کالا ہول ناک ہیولا، جو مرکے نہیں دیتا۔ اس پر سانپ چھتریاں اور جنگلی گھاس نکل آتی ہے۔

اس وقت تک میں گلی کی آوازوں سے مانوس ہوگیا تھا۔ صبح سویرے اسکول بس کا ہارن۔ دوپہر کو رفیع صاحب کی گاڑی کی آواز جو پچھلی کھڑکی سے آتی تھی، اور وہاں سے نظر آنے والا ان کے مکان کا برآمدہ، اخبار والے کی پکار جس سے بیرونی دنیا گلی میں گونج اٹھتی، اور اونچے پیڑوں سے چھن چھن کر دیواروں پر اترتی ہوئی دھوپ کے متحرک رنگین سائے۔ یہاں زندگی کا اپنا ایک انداز اور رفتار تھی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں اس میں کھپ جاؤں گا۔

پیڑ کے نیچے سے گھاس بالکل اڑی ہوئی تھی۔ لان وہاں سے گنجا لگتا تھا۔

"بڑے پیڑ کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ اس کے سائے میں کوئی اور چیز پنپ نہیں سکتی۔" امی کہنے لگیں۔ "گز بھر دور بھی کیاری کھودو تو اس کی ریشے دار جڑیں نکل آتی ہیں۔"

اس کو ایک دفعہ میں نہیں کاٹا جا سکا۔ کلہاڑی والا آدمی شاخوں شاخوں پیر رکھتا ہوا اوپر چڑھ گیا اور چھوٹی ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ ان چھوٹی ٹہنیوں کے کٹ جانے کے بعد، جن کی لچک دار

www.taemeernews.com

ڈنڈی میں لکڑی نہیں بنی تھی۔ وہ پیڑ مینار کی طرح لمبا اور سیدھا لگ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے چھال ادھڑ جانے کے بعد تنا کیسا نیا نکور نکل آیا تھا۔ اور اس کے شاداب جسم سے لپٹا ہوا وہ آدمی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیڑ کی آبروریزی کر رہا ہے۔ کلہاڑی گنگنا رہی تھی۔ وہ آدمی پسینے پسینے ہوا جا رہا تھا۔ کٹتے ہوئے پیڑ کے پتوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ کلہاڑی کی ضربوں سے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اڑ رہے تھے۔ ان کا رنگ اندر سے کتنا صاف تھا، بالکل اجلا گودا۔ ایک ٹکڑا اڑ کر اس آدمی کی آنکھ میں پڑ گیا جو جڑوں کے پاس گھاس چھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھ سے خون ٹپکنے لگا۔ جب اس کی آنکھ پر ہری پٹی باندھ دی گئی تو اس کے بعد تین آدمیوں نے تنے پر رسی باندھی کہ وہ چھت پر نہ گر پڑے، ورنہ چھت بیٹھ جانے کا خطرہ تھا۔ پھر بھی جہاں جہاں بڑی ٹہنیاں گریں لان میں گہرے گڑھے پڑ گئے۔ سارا لان یوں ادھڑا ہوا لگ رہا تھا جیسے کوئی دیو قامت ڈینوسار اسے روندتا ہوا گذرا ہو۔ پیڑ کا تنا آندھی کی زد میں آئے ہوئے بادبانی جہاز کے مستول کی طرح ڈول رہا تھا۔ مگر وہاں موجوں کی اچھال تھی نہ کھوپڑی اور ہڈی والا سیاہ پرچم۔ ٹوٹتی ہوئی شاخ یوں چرچراتی جیسے پیڑ کراہ رہا ہو، اور دھپ سے گر پڑتی۔ پتے دیر تک تماشا دیکھنے والے بچوں کی طرح تالیاں بجاتے رہتے۔

پیڑ کا تنا جہاں دیوار سے ٹکا ہوا تھا، دیوار کا اتنا حصہ ڈھے پڑا۔ اس کے اوپر لگی سیمنٹ کی جالی کا ڈیزائن گر کر بکھر گیا۔ ٹوٹی دیوار پر سے ایک کوّا آیا اور اپنی چونچ سے زمین کھودنے لگا۔ کوّے کو زمین کھودتے دیکھ کر میں نے تعجب کیا۔ مگر یہ خواب نہیں تھا۔ خواب تو میں نے اس رات دیکھا تھا۔ نئے مکان میں میرا پہلا خواب۔

اس رات میں نے ظہیر کو خواب میں دیکھا۔ اس کے کمرے میں امی نے دیوار پر اس کی تصویر لٹکا رکھی تھی۔ میں اس کے سامنے روزانہ اگر بتی جلاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ نیا مکان دیکھنے آیا ہے۔ اسی پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا ہے، اس کی شاخوں اور جڑوں میں اگ رہا ہے، اس کی سبز آنکھوں میں مسکراہٹ ہے، ہاتھوں میں گوشت کے ٹکڑے اور مجھ سے کہہ رہا ہے، "یہ لو بھائی، یہ میرا جسم ہے، اس سے اپنی بھوک مٹاؤ۔"

۱۹۸۴

ooooo

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

بحیرۂ مردار

www.taemeernews.com

*

ساجدہ کا چہرہ پیلا پڑتا جارہا تھا۔ اس بار بہت احتیاط کی ضرورت تھی، ڈاکٹر نے کہا تھا۔ اس سے پہلے تین دفعہ ایسا ہوچکا تھا۔ حالاں کہ وہ پہلے دن سے احتیاط کرتی تھی۔ نہ سیڑھیاں چڑھنا، نہ بوجھ اٹھانا، نہ کوئی اور ایسا کام جس سے تھکن ہو۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر معائنہ کرنے کے بعد کہتا کہ آپ جتنی تاریخ بتارہی ہیں اس کے حساب سے تو یہ کم لگتا ہے۔ مگر اس میں بھول جانے یا غلطی کرنے کا بہت کم امکان تھا۔ ساجدہ کپڑوں کی الماری کی نچلی دراز میں رکھی ہوئی ڈائری میں اپنی تاریخوں کا حساب رکھتی تھی۔ وہ ہر کام اسی طرح ایک خاص سلیقے اور باقاعدگی سے کرتی تھی۔ اور تینوں مرتبہ ایسا ہوا کہ سوتے میں گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی اور میں بستر میں خون کے نشان دیکھ کر چونکا۔ وہ غنودگی اور نیم بے ہوشی کی ملی جلی کیفیت میں پڑی رہتی اور رات میں کسی وقت خون جاری ہو جاتا۔ صبح تک خون کے اتنے اتنے بڑے جمے ہوئے ٹکڑے نکلنے لگتے۔ اسپتال بھی لے گئے مگر ہر بار یہی جواب ملا کہ ان کا حمل ضائع ہوچکا ہے۔

ہم دونوں اس دفعہ بہت فکر مند تھے۔ ہر بات بالکل ٹھیک ٹھاک ہو، کہیں ذرا سی بھی اونچ نیچ نہ ہونے پائے۔ ہر بار ایسا کیوں ہو جاتا تھا؟ یا تو بیج میں قوت نمو نہ تھی یا زمین زرخیز نہیں تھی۔ ایک دوسرے سے بہت محبت کرنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کی صلاحیتوں پر شک کرنے لگے تھے۔ اور ایک دوسرے پر ظاہر کیے بغیر ہم اندر ہی اندر ڈرتے بھی بہت تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میرے گھر کے آنگن میں آم کا ایک پیڑ تھا۔ اونچے پیڑ کی پھننگ میں میری پتنگ پھنس جاتی اور اسے اتارنے کے لیے میں پیڑ پر چڑھتا تو پیڑ کے ہلنے سے بور جھڑنے لگتا تھا۔ اماں اندر بیٹھے بیٹھے چلا کر کہتی تھیں "نیچے اتر آؤ! بور کچا جھڑ گیا تو پھل کیسے آئیں گے؟" اس پیڑ میں چوسنے والے آم لگتے تھے۔ میں انہیں کتنے شوق سے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ آم کے پیڑ کو بیماری لگ گئی۔ سارا بور کالا ہو کر جھڑنے لگا۔ اس سال یہ اکیلا پیڑ تھا جس پر کوئل نہیں بولی۔

اس پیڑ کے آم میں گٹھلی اتنی سی ہوتی تھی اور گودا بہت سارا۔ میں اپنے بچپن کے اس پیڑ کو اکثر یاد کیا کرتا تھا۔ کاش اس کی کوئی گٹھلی وہاں سرحد پار سے اڑتی ہوئی آئے اور میرے صحن میں گر جائے۔ میں نے ساجدہ کو بھی اس پیڑ کے بارے میں بتایا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتاتے تھے۔ ساجدہ کو چھپکلی سے ڈر لگتا تھا اور مجھے اونچائی سے۔ ساجدہ نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ تین چار سال کی تھی (ہم نے اسی طرح اپنی ملاقات سے پہلے کی پوری زندگی باتوں باتوں میں ساتھ بتالی تھی) تو وہ غسل خانے جانے سے پہلے دیواروں پر خوب اچھی طرح نظر دوڑا کر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں چھپکلی نہ ہو۔ جس جگہ چھپکلی ہوتی وہ وہاں

www.taemeernews.com

نہیں جاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ نہا رہی تھی اور نہاتے نہاتے چھت کی طرف نگاہ جو اٹھی تو روشن دان کے نیچے یہ موٹی چھپکلی۔ اسے ایسا لگا کہ چھپکلی اسے دیکھ رہی ہے اور اب اس پر گرا چاہتی ہے۔ اس کے ہاتھوں سے صابن پھسل گیا۔ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ ایک کونے میں سہم کر کھڑی ہو گئی، آنکھیں چھپکلی پر سے ہٹنے کا نام نہ لیں، چہرے پر صابن کا پانی اور آنسو بہے جائیں اور ہونٹ رکے بغیر دعا مانگے چلے جائیں کہ اچھے اللہ میاں یہ چھپکلی یہاں سے چلی جائے پھر میں ہمیشہ امی کا کہنا مانوں گی۔ کتنی صدیوں تک وہ چھپکلی کے خوف میں کھڑی وہاں روتی رہی۔ چھپکلی دیوار پر چپکی رہی۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے نہیں معلوم۔ جب آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ وہ غسل خانے میں بے ہوش ہو گئی تھی اور دروازہ توڑ کر اسے باہر نکالا گیا تھا۔

صبح کا ناشتہ بناتے ہوئے ساجدہ انڈے میں ایک طرف ذرا سے چھید کر کے زردی اور سفیدی کڑھائی میں ڈالتی تھی تو کھولتا ہوا گھی چیخنے لگتا۔ وہ انڈے کا چھلکا پورا نہیں توڑتی تھی۔ خالی چھلکا دروازوں کے اوپر، کھڑکیوں میں اور الماریوں کے پیچھے رکھ دیتی تھی۔ اس کی بو سے چھپکلی نہیں آتی، اس کا کہنا تھا۔ وہ روز صبح گھر کے کونوں میں انڈے کے تازے چھلکے رکھتی تھی۔ میں نے گھر کے سارے کھڑکی دروازوں پر جالی لگا دی تھی۔ میں اس کے خوف کا احترام کرتا تھا۔

میرا خوف اونچائی کا ہے۔ بلندی پر سے نیچے جھانکوں تو سر چکرا جاتا ہے، لگتا ہے نیچے گر پڑوں گا۔ میں دوسروں کو بھی ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، کیوں کہ مجھے اونچائی کے تصور سے گھبیری آجاتی ہے۔ کراچی آنے کے بعد جب ہم برنس روڈ کے ایک فلیٹ میں رہے تھے، تو اس فلیٹ کی بالکنی میں جاتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ ایک تو میں ایسے گھر میں رہنے کو بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کر پایا تھا جو زمین پر ٹکا ہوا نہ ہو۔ میں نے کبھی بالکنی کے جنگلے پر سے جھک کر نیچے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ سامنے والوں کا لڑکا طاہر اس جنگلے پر کھڑا ہو کر چلتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ڈر لگتا تھا۔ اگر یہ گر پڑا تو؟ کتنی تیزی سے ان چکرا دینے والی گہرائیوں میں گرتا چلا جائے گا۔ کنوئیں میں گرتے ہوئے پتھر کی طرح، ہوا کو کاٹتا ہوا، پھر نیچے گلی میں اس کی ہڈیوں کا سرمہ بکھرا ہوا ہوگا۔ طاہر نے آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد اس جنگلے پر چل کر دکھایا تھا۔ میں نے اس وقت اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اگر وہ سرکس کے بازی گر کی طرح مجھے بلانے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دے تو؟ پھر میں اونچائی کے بلاوے سے کیسے انکار کر سکوں گا؟

میں جس اخبار میں کام کرتا ہوں، اس کے دفتر میں اتنی سیڑھیاں ہیں کہ سوچ کر ہی سر چکرا جاتا ہے۔ مجھے وہ ساری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا تھا۔ کیوں کہ بڑے صاحب نے بلایا تھا۔ بڑے صاحب یعنی اخبار کے مالک۔ میں اس اخبار کے نائب مدیروں میں سے ایک تھا۔ میں

www.taemeernews.com

وہاں دن دن بھر کام کرتا تھا اور ضرورت پڑنے پر رات کو بھی۔ پھر بھی میرا نام اخبار کے آخری صفحے پر خبروں کے نیچے چھپی ہوئی یک سطری اطلاع میں نہیں آتا تھا کہ فلاں پبلشر اور فلاں پرنٹر نے فلاں پروپرائٹر کے لیے فلاں جگہ سے شائع کیا۔ جو کام صحیح طور پر نہ ہوتا تھا اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اور جو کام ٹھیک ہو جاتا تھا اس کا کریڈٹ مجھ کو نہیں دیا جاتا تھا۔ بڑے صاحب نے دو دن پہلے کا اخبار میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کا اداریہ میرا لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اخبار میرے سامنے سرکایا تو مجھے ایسا لگا کہ میرا لکھا ہوا میرے خلاف شہادت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

"آپ کے لکھے ہوئے مضامین میں خیالات کے انتشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔ "ابھی ایک بات کہہ رہے ہیں، ابھی دوسری شروع کر دی۔ کہیں آپ بہت گھما پھرا کہ بات کہتے ہیں اور کہیں بالکل ہی صاف بات کہہ دیتے ہیں۔" میں چپ رہا۔ میں نے کسی مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا حلف نہیں اٹھایا تھا۔ "آپ کے لکھے ہوئے اداریے میں ایک خاص زاویہ نظر آتا ہے، ایک خاص نقطۂ نظر۔۔۔" وہ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف خاکی رنگ کا وہ لفافہ بڑھا دیا۔ جس میں حکومت کے محکمے کی طرف سے اخباری پالیسی کے بارے میں ہدایات آتی تھیں۔ اس لفافے کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے یاد آنے لگا کہ کالج کے زمانے میں میں نے ایک جلوس میں شرکت کی تھی۔ جلوس کے لڑکوں نے مطالبوں کے حق میں نعرے لگائے تھے۔ نعرے لگاتا ہوا جلوس شاہراہ پر نکل آیا تھا اور گذرتی ہوئی ایک سرکاری بس پر پتھر مارے تھے۔ ایک پتھر میں نے بھی مارا تھا۔ اس پتھر کا لمس مجھے اب تک یاد تھا۔ اور کالج یونین کے انتخابات کا وہ زمانہ، اپنی پارٹی کے امیدواروں کو ساتھ لیے لیے گھومنا، رات رات بھر کی سیاسی بحثیں، پلے کارڈ اور بینر بنانا، گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانا، مخالفوں کو دیکھ کر طنزیہ انداز سے مسکرانا اور اپنے کسی ساتھی سے آنکھیں چار ہوتے ہی دو انگلیاں اٹھا کر فتح کا نشان بنانا۔۔۔۔ کالج سے نکلا تھا تو لگتا تھا کہ ساری دنیا میرے قدموں تلے ہے، زندگی کالج کا وہ تقریری مقابلہ ہے جس میں مجھے ٹرافی ہر حال میں مل ہی جاتی تھی۔ اور بہتر زمانہ بس اب آ ہی رہا ہے۔ وہ جو میں تھا اور وہ جو میں ہوں، ہم دونوں آپس میں اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ کیا میں ضائع ہو گیا؟ اب سارے وقت ٹیلی پرنٹر کو کاغذ کی پٹیاں اگلتے ہوئے دیکھنا اور یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی خبر کہاں لگے گی، کہیں دور کے انقلاب کی خبر بڑی ہے یا قریب کے فساد کی، قتل کی واردات پہلے صفحے پر آئے گی یا مرکزی وزیر کی تقریر۔ جس سڑک پر میرا دفتر تھا، اس پر کئی اور اخباروں کے دفاتر بھی تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ میکلوڈ روڈ پاکستان کی فلیٹ اسٹریٹ ہے اور اس پر مجھے فوراً خیال آیا تھا کہ دو طرف بڑی بڑی عمارتوں میں گھری ہوئی میکلوڈ روڈ ایک لمبے برآمدے کی طرح ہے، ہوا چلتی ہے تو اس میں سے سنسناتی ہوئی گزر جاتی

www.taemeernews.com

ہے جیسے کسی سرنگ سے گزر رہی ہو۔ ان عمارتوں میں ہوا نہیں آتی۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کس کے سامنے ہوں۔ میں چونکا تو میری نظر ان کے ہاتھوں پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ ان کے دائیں ہاتھ میں پانچ کے بجائے چھ انگلیاں ہیں، چھوٹی انگلی کے ساتھ، درخت کے دو شاخے کی طرح ایک اضافی انگلی بھی موجود تھی۔ اس انگلی کے گٹے پر چھوٹے چھوٹے بال آگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے زیادہ تعجب اس اضافی انگلی کی موجودگی پر تھا، یا اس بات پر کہ اس کے گٹے پر بال آگے ہوئے ہیں۔ پھر ان کی آواز میری کانوں میں دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مجھے اداریہ لکھنے کی خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اداریے والے صفحے سے ہی ہٹا دیا گیا ہے۔ میری خدمات اب اخبار کے ہفتہ وار میگزین ایڈیشن کو پیش کی جا رہی ہیں۔ میرے مستقبل کے بارے میں اگلے فیصلے کے ہونے تک مجھے ہر ہفتے میگزین کے لیے "مانیں یا نہ مانیں" والا فیچر لکھنا ہوگا، وہی فیچر جس میں دنیا بھر سے تعجب خیز اور انوکھی باتیں جمع کر دی جاتی ہیں۔ وہاں سے باہر نکلا تو سارے جسم پر چیونٹیاں سی کاٹ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک دفعہ چیونٹیوں والی قمیض پہن لی تھی۔ ساجدہ ہمیشہ کہتی تھی کہ کپڑے جھاڑ جھٹک کر پہنو، کوئی کیڑا نہ ہو۔ اس روز جلدی میں خیال نہ رہا۔ مئی جون کے دن تھے۔ غسل خانے میں نمی اور ٹھنڈک کی وجہ سے چیونٹیاں کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں میں گھس جاتی تھیں۔ جب میں بس میں بیٹھ کر دفتر جا رہا تھا تو کلبلاہٹ شروع ہوئی۔ پہلے میں سمجھا کہ گرمی دانوں میں پسینے کے چپکنے سے مرچیں لگ رہی ہیں۔ پھر کھجلی بڑھی اور کھجاتے کھجاتے دیوانگی کی سی کیفیت ہو گئی۔ سارے بدن میں جلن ہونے لگی اور سرخ سرخ ددوڑے پڑ گئے تھے۔ ان کے دفتر سے باہر نکل کر میں نے دیوار کا سہارا لیا۔ کمرے کے باہر لمبا برآمدہ تھا اور برآمدے کی دوسری دیوار میں کھڑکیاں۔ میری نگاہ کھڑکی سے ہوئی ہوئی نیچے چلی گئی۔ دو رویہ عمارتوں کے بیچ میں میکلوڈ روڈ بچھی ہوئی تھی۔ اور ساری عمارتیں گڑیا گھر کی طرح نظر آ رہی تھیں، چھوٹی، غیر حقیقی اور اپنے سے بڑے کسی ہاتھ کے کھیلنے کے واسطے بنائی گئی۔ ایک چیل اڑتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کے کھلے ہوئے پروں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہوا میں اڑتی ہوئی چیل کو آنکھیں جھکا کر دیکھ رہا ہوں، چیل جو ہمیشہ اوپر اڑتی ہوئی نظر آتی ہے، اس وقت نیچے نظر آ رہی ہے۔ میں اس کی پرواز کی سطح سے اوپر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ اونچائی! ایک بیک میرے سامنے کھلی کھڑکی کا منظر گھوم گیا۔ ان کا دفتر سب سے اونچی منزل پر تھا، اور اس دفتر کی عمارت میں اتنی منزلیں ہیں جتنے میری زندگی میں سال بھی نہیں۔ کھڑکی میں سے گول گھومتی ہوئی گہرائی نظر آ رہی تھی جو منہ پھاڑے میری طرف بڑھی۔ میں لٹو کی طرح گھومتا ہوا نیچے جا رہا ہوں۔ میرے بازو ہوا کو چپوؤں کی طرح کاٹ رہے ہیں، کانوں میں سیٹیاں بج رہی ہیں۔ اگر میں کھڑکی کی لکڑی کو پکڑ نہ لیتا تو تیورا کر

www.taemeernews.com

نیچے گر پڑتا۔

میں وہاں سے آکر اپنی ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ مجھے اتنے عرصے میں کیا حاصل ہوا، اصولوں کی شکست، غلاموں جیسی مشقت، ہر قدم پر مصالحت اور تھکن جو روز میں اپنے جسم میں دن بھر کی کمائی کی طرح سمیٹ کر گھر روانہ ہوتا تھا۔ سارے دن کالموں کی خالی جگہوں میں کتابت شدہ مسالہ، خبریں، اشتہار اور تصویریں لگانا اور پھر وہی اعضا شکن ماندگی۔ شام ہوتے ہی مجھے لگتا کہ کراچی تھک گیا ہے، سارے لوگ تھک گئے ہیں، تمام عمارتیں تھک چکی ہیں۔ کراچی، سارے لوگ، تمام عمارتیں۔۔ میرے دفتر کی دیواریں تھکن کے بوجھ سے پھٹی جارہی ہیں۔ اور ان کی تھکن ریڈیائی لہروں کی طرح میرے جسم میں داخل ہورہی ہے۔ یہ تھکن رگ وریشے میں اتر کر سارے بدن میں تحلیل ہورہی ہے۔ اب جانے کا وقت آگیا ہے۔

گھر۔۔۔ تھکن کی ایک اور مسافت کے فاصلے پر۔ واپسی کا سفر آغاز کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ بہت کوشش کے بعد کرسی سے اٹھا تو ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ گھٹنے مڑ نہیں رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر سارا شہر جمائی میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس عادی نشے باز کی جمائی جس کو نشے کی طلب ہورہی ہو اور نشہ مل نہ رہا ہو، جمائیوں پر جمائیاں، آنکھوں سے پانی بہتا ہوا، بدن ٹوٹتا ہوا۔۔۔ دماغ شل ہوا جارہا ہے۔ جیسے کئی گھنٹے کھلے سمندر میں تیرنے کے بعد بازو شل ہوجاتے ہیں، پٹھوں میں گٹھلیاں سی پڑنے لگتی ہیں، سارا بدن کسی غیر لچک دار دھات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ دھڑکا کہ موجوں کے اگلے اچھال میں یہ سیدھا تہہ کی طرف اتر جائے گا۔ میں سیڑھیوں سے اتروں کہ لفٹ سے جاؤں۔ دماغ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ سیڑھیوں سے جاؤں اور پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی چکر آگیا تو؟ لفٹ سے جاؤں اور دو منزلوں کے بیچ میں بجلی چلی جائے تو میں اس آہنی پنجرے میں ٹنگے ٹنگے دم گھٹ کر مرجاؤں گا۔ نیچے اتر کر وہی واپسی کا شور۔ بے چہرہ ہجوم دفتروں سے نکل گھر کا رخ کررہا ہے۔ سارا شہر تھک چکا ہے۔ لوگ نیند میں چل رہے ہیں۔ شام کے دھندلکے میں میکلوڈ روڈ کی عمارتیں نکوٹین چڑھے دانتوں کی طرح بدرنگ دکھائی دے رہی ہیں۔ سڑک چربی سے بھری رگوں کی طرح چل رہی ہے۔ مجھ سے ایک قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ کمر تختہ ہوئی جارہی ہے۔ کندھے نامعلوم بوجھ سے جھک کر رہ گئے ہیں۔ ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ اب اور کتنی دور جانا ہے؟ ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہے۔

جو دن اس تھکن پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے، وہ شروع کسی اور طرح سے ہوا تھا۔ (شروع ہوا تھا یا اب ہونے والا تھا؟ میں وقت کی ترتیب میں گڑبڑا جاتا ہوں۔ جو ہورہا ہے اور ہونے والا ہے آپس میں اس طرح گڈمڈ ہوجاتے ہیں جیسے ہوا کے اڑائے ہوئے ورق)۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ اس سگنل پر جہاں سے سڑک ایک غیر ملکی سفارت خانے کے لیے مڑجاتی ہے، شام کے وہ اخبار بٹتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے جو دوپہر تک چھپ کر آجاتے ہیں کہ اپنے پڑھنے والوں میں سنسنی

www.taemeernews.com

پیدا کر دیں۔ ایک سوزوکی وین اخباروں کی گڈیاں فٹ پاتھ پر پھینک گئی۔ ہاکر لڑکے الگ الگ صفحوں کو ترتیب سے جمانے لگے۔ یہ ابھی انہیں ترتیب دے لیں گے اور اپنے میلے کپڑوں، مفلس چہروں کے ساتھ آج کی تازہ خبر چیختے ہوئے سگنل پر رکنے والی ہر گاڑی میں فروخت کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی یہ خبریں ان صفحوں سے نکل کر دنیا میں پھیلی نہیں ہیں، کسی طرح بھاپ دے کر ان گیلے سیاہ حروف کو مٹا دیا جائے تو کیا یہ واقعات جو ہو چکے ہیں، یہ بھی مٹ جائیں گے؟

اسی سگنل پر ایک دن میں نے ایک گدھا گاڑی کو الار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ گاڑی بان نے گاڑی میں بے تحاشا لکڑی کے تختے اور پیٹیاں لاد رکھی تھیں۔ لکڑیاں گاڑی سے کئی ہاتھ پیچھے کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ یہ کسی تعمیر میں استعمال ہوں گی، اور ان کے فریم پر عمارت کا ڈھانچہ کھڑا ہوگا۔ بری طرح لدی ہوئی گاڑی پر وہ اور تختے چڑھائے جا رہا تھا۔ اس نے گدھے کی لگام کھینچی مگر گدھا چل کے نہ دیا۔ گاڑی بان نے ٹین کا ڈبا، جس کے اندر کنکر بھرے ہوئے تھے اور آگے کا حصہ دبا کر چونچ کی طرح نکیلا بنا دیا گیا تھا، گدھے کے پچھائے میں بھونک دیا۔ گدھے نے زور لگایا مگر گاڑی کھینچ نہ سکا۔ گاڑی بان نے ڈبے کے کنکر بجاتے ہوئے پھر چبھویا۔ ایک دم سے گاڑی بیٹھ گئی اور گدھا اوپر اٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ ہوا میں ٹانگیں چلاتا رہا۔ پھر لگام ٹوٹ گئی اور ہوا میں معلق گدھا بڑے زور سے نیچے گر پڑا۔ اس کی ہڈیاں کڑکڑانے کی آواز آئی اور سڑک پر خون کا گدلا جوہڑ بن گیا۔ اس وقت مجھے بہت ہنسی آئی تھی۔ پھر بالکل نہیں آئی۔ آج گھر واپس ہوتے ہوئے میں نے مصروف شاہراہ کے بیچوں بیچ وہ دھبا دیکھا جہاں اپنی حد سے زیادہ بوجھ نہ کھینچ سکنے والے گدھے کا خون جمع ہو گیا تھا۔ تارکول کی سیاہ چکنی سڑک پر یہ دھبا کوڑھ کے داغ کی طرح نظر آ رہا تھا۔

میں نے یہ دھبا بس میں بیٹھے بیٹھے دیکھا تھا۔ میں اس دھبے کے پاس نہیں اترا بلکہ ہمیشہ کی طرح ایمپریس مارکیٹ پر اترا جہاں سے گھر جانے کے لیے دوسری بس بدلتا ہوں۔ وہاں کی وہی دھکم پیل، بھیڑ بھڑکا، شور، وہی ہجوم۔ انسانوں کا یہ طوفان نہ جانے کس بڑھیا کے تندور سے نکلا ہے۔ ایک دم سے مجھے لگا کہ اس ہجوم نے ہانکا کر کے مجھے گھیر لیا ہے۔ یہ لوگ نہیں ہیں، نظر نہ آنے والے پنجرے کی تیلیاں ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میری پیٹھ پر روٹیوں کا تھال بندھا ہے، اور یہ سارے لوگ عزیز مصر کے اس زندانی کے خواب والے کوے ہیں جو مجھے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں، گھر جاتے میں میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اضمحلال کے ساتھ افسردگی اور خوف مل جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کچھ ہو گیا ہے اور میں اس کے بارے میں بے خبر ہوں۔ کوئی سانحہ پیش آ چکا ہے۔ جو میری ساری زندگی کو ہلا کر رکھ دے گا، میں اس کے بارے میں اب کچھ نہیں کر سکتا اور میں اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ گھر پہنچتے ہی دروازہ کھولوں گا

www.taemeernews.com

اور وہ حادثہ میرے ہوش و حواس پر بم کی طرح پھٹ پڑے گا اور میں دھماکے سے لرز جاؤں گا۔ جوں جوں گھر نزدیک آنے لگتا ہے ٹل نہ سکنے والی تباہی کا احساس شدید ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب تک گھر پہنچ کر ساجدہ کو دروازے پر کھڑے ہوئے نہ دیکھ لوں اعتبار نہیں آتا، اور کیا پتہ وہ بھی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔

"اس کی کوکھ ہری نہ ہونے کی، نگوڑ ماری بانجھ ہے"۔ اماں روزانہ گھر میں گھستے ہی میری ٹانگ لیتی تھیں۔ "بیٹا دوسری شادی کرلو"۔ میری تیوری پر بل دیکھ کر وہ بکتی جھکتی صحن میں چلی جاتیں۔ وہاں سے بھی ان کی آواز صاف سنائی دیتی۔ "میرا کیا ہے، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، یہی حسرت لیے چلی جاؤں گی کہ پوتی پوتا کھلاؤں، کیا خبر تھی مجھ جنم جلی کو اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر لائی تھی۔" ساجدہ میری طرف دیکھ کر نگاہیں جھکا لیتی۔ نہ وہ کچھ کہتی نہ میں۔ ہم اس موضوع پر کبھی کچھ نہ کہتے۔ ہمیں اس کا احساس ضرور تھا مگر ہم اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے۔ اعتراف کرنے کے بعد کوئی عملی قدم اٹھانا لازم ہو جاتا ہے۔ وہ عملی اقدام کیا ہو سکتے تھے، ہم ان سے خائف تھے۔

"اس معاشرے میں بچے پیدا کرنا جرم ہے، جہالت ہے۔ خود بچوں کے ساتھ ناانصافی ہے، آخر ہم انہیں کس دنیا میں آنے پر مجبور کر رہے ہیں" کبھی کبھی میں یونہی کہتا تھا۔ اس طرح جیسے یہ کسی اور کی بات ہو۔ میں یہ کس کو باور کرا رہا تھا، اسے یا اپنے آپ کو؟

میرے دوست بھی دوسری شادی کا مشورہ دیتے تھے۔ اگر مجھے ان کے خلوص کا یقین نہ ہوتا تو شاید میں اس مشورے کا برا مانتا۔ دوسری شادی کس لیے؟ کیا اولاد ہی سب کچھ ہے؟ ساجدہ جو اس حد تک میری مزاج شناس ہے، ہم نے جو اتنا سارا وقت ساتھ گذارا ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں؟ ہم میں جو احساس رفاقت ہے کیا وہ غیر اہم ہے؟ مگر میں یہ دلائل کسی کے سامنے کیوں پیش کروں؟

اور میں ساجدہ پر کیوں الزام رکھوں۔ اگر اس ناکامی کا ذمہ دار میں نکلا، تو پھر؟ اس کے بعد اپنی ذات پر سے رہا سہا اعتماد بھی اٹھ جائے گا۔ مگر اپنی نامرادی کا سبب ڈھونڈنے سے زیادہ دوسرے کو دکھ دینے کا اندیشہ تھا۔

میں نے بہت احتیاط کی تھی کہ جب وہ مجھے اپنے حاملہ ہونے کی خبر سنائے تو غیر معمولی خوشی کا اظہار نہ کروں۔ اس لیے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بچے کی کمی محسوس کرتا رہا ہوں۔ میں اس کے اندر احساس محرومی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے پہلے دن سے یہ اہتمام رکھا کہ وہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی احتیاطی تدابیر پر سختی سے عمل کرے۔ میں اس کی غذا کا بھی پورا خیال رکھتا تھا۔ وہ پھل پروٹین زیادہ کھائے اور پریشان بالکل نہ ہو۔ کام بھی زیادہ نہیں کرنے دیتا تھا۔ گھر کا کام تو پہلے بھی زیادہ نہ تھا، وہ خود ہی اپنے مزاج کی وجہ سے کام بڑھا لیتی

www.taemeernews.com

تھی۔ دھلی ہوئی چیزوں کو دوبارہ دھو ڈالتی تھی۔ شادی کے بعد ہی اس نے اصرار کیا تھا کہ اس کے اور میرے تولیے الگ ہوں، اور ہمارے پانی پینے کے گلاس کہیں غلطی سے ادل بدل نہ ہو جائیں اس لیے ان کی نشانی مقرر کی جائے۔ گھر کا فرش روزانہ دھلتا تھا۔ اور باہر سے آنے والی چیزیں اس طرح صاف کرلی جاتیں کہ ان پر ذرا بھی دھول مٹی نہ رہ جائے۔ "یہ گھر ہم نے تنکا تنکا جوڑ کر بنایا ہے" وہ کہتی تھی "جس طرح چڑیاں گھونسلا بناتی ہیں۔"

سہ پہر کے وقت ایک نرس آکر ساجدہ کے گلوکوز کا ڈرپ لگاتی تھی۔ جتنی دیر ڈرپ چڑھی رہتی ساجدہ کو مجبوراً بستر پر لیٹنا پڑتا اور وہ گھر کی صفائی سے دور رہتی۔ دفتر سے آکر میں ڈرپ کی سوئی نکالتا اور اسے قید سے رہائی دیتا۔ اس رات میں نے ساجدہ کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھا تو اس کے ماتھے پر ایک بال کی جڑ میں کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے ناخن مار کر اسے پھوڑ دیا۔ چھوٹا سا دانہ تھا جس میں پیپ کی ننھی سی بوند تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ اس کے سر میں لگی ہوئی کیل ہے اور اسے میں نے پکڑ کر کھینچ لیا تو اس کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی اور وہ چڑیا بن کر اڑ جائے گی۔ میں اسے کھو دینے کے خیال سے کانپ اٹھا۔ اس رات ساجدہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کمر میں بھی درد تھا۔ اس نے نیند کی گولی کھائی تو پانی کا گلاس میں نے لاکر دیا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی بستر پر خون کے وہ پہلے دھبے نہیں دیکھے جو اجلی، کوری چادر میں جذب ہو کر اسے گلنار کر گئے۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب ساجدہ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل زور سے دھڑکا اور فوراً میں سمجھ گیا کہ مجھے جس سانحے کا اندیشہ تھا وہ پیش آچکا ہے۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا اور خوف کے سبب سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے شلوار اتار ڈالی تھی۔ شلوار بستر سے نیچے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ نیفے سے لے کر پائنچے تک اس پر خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ ساجدہ کی ٹانگوں کے نرم نرم روئیں پر خون ملا ہوا تھا۔ خون بہہ کر اس کی ایڑیوں سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے اپنا سہما ہوا چہرہ میری طرف پھیر دیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جانگھ کی طرف اشارہ کیا جہاں جمے ہوئے خون کا اتنا بڑا لوتھڑا پڑا ہوا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔

میں اس کو بازوؤں میں اٹھا کر اسپتال لے گیا۔ جتنی دیر ڈاکٹروں نے ایمرجنسی تھیٹر میں اس کا معائنہ کیا میں باہر بنچ پر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر نے باہر نکل کر صرف ایک لفظ کہا۔ وہی لفظ جس کا خوف میرے اندر سرطان بن کر پھیل رہا تھا، اتنا شدید خوف کہ جس کا اعتراف میں اپنے سامنے کرنے کی لیے بھی تیار نہیں تھا۔ وہی لفظ جس کو سن کر میں مایوسی کے بھنور میں گھر گیا۔

ڈاکٹر نے باہر نکل کر کہا: "ابورشن"۔

ساجدہ کے گھر واپس آجانے کے بعد ہم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ہم نے

www.taemeernews.com

اپنے غم اور مایوسی میں ایک دوسرے کو شریک نہیں کیا۔ میری روح کے اس حصے میں چوٹ لگی تھی جہاں میری رسائی بھی نہ تھی، لہذا مرہم کیا رکھتا۔ وہ زخم کلستا رہا۔ میں بے بس تھا۔ اور رونے پر مجبور تھا۔ مگر میں رویا نہیں۔ ساجدہ بھی نہیں روئی۔ حالانکہ میرا جی چاہا کہ اسے رلاؤں۔ وہ دل بھر کر روئے تاکہ اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ مگر ہمارے آنسو بہنے سے پہلے ہی سوکھ گئے تھے۔

اتنے دن میں نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ میں سارے وقت گھر پر ہی رہتا۔ ساجدہ کے ساتھ۔ ساجدہ دن بھر بستر پر پڑے پڑے ریڈیو سے فرمائشی فلمی گیت سنتی رہتی اور اپنی پسند کے گیتوں کے لیے پروگرام میں خط لکھتی رہتی۔ اس نے کتنے بہت سارے خط لکھے۔ کتنے ہی گیت جو اس نے سننے چاہے نشر نہیں ہوئے اور اس کے پیغام خلاؤں میں بکھر کر کھو گئے۔ دن میں کئی بار نظریں گھڑی کی طرف اٹھ جاتیں کہ اچھا اب اتنا وقت گذرا ہے اور اب اتنا گذرنا باقی ہے۔ نہ جانے کیوں گھر میں سونا پن محسوس ہوتا تھا۔ کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ مگر وہ چیز کیا تھی، یہ نہ ساجدہ کو معلوم تھا نہ مجھے۔ میں نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ باہر چلو جی بہلے گا۔ مگر وہ رونے لگی۔ "جو کچھ ہوا اسے آپ نے ایک بیماری سمجھا، مستقبل کا خواب نہیں سمجھا" وہ روتے ہوئے بولی۔

میں خاموشی سے اٹھ کر کرتے پاجامے کی جگہ پتلون قمیض پہننے لگا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں" اس نے پوچھا۔

"دفتر"، میں نے جواب دیا اور باہر چلا آیا۔

بہت دن کے بعد دفتر گیا تو پھیکے پن کا احساس اور بھی شدت سے ہوا۔ روزمرہ کا وہی کام جو عادت ثانیہ بن گیا تھا، اکتاہٹ کا پہاڑ بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا۔ مگر قلم کی نوک پر الفاظ نہیں بنے۔ کاغذ سادہ ہی رہا۔ مجھے "مانیں یہ نہ مانیں" کا نیا فیچر لکھ کر دینا تھا۔ وہی انوکھی باتیں جن کو پڑھ کر آپ دنگ رہ جائیں (یا کم از کم رہ جانا چاہیے)۔ کیا آپ کو معلوم ہے درخت کے تنے کو کاٹا جائے تو اس کے اندر بنے ہوئے حلقے درخت کی عمر کی نشان دہی کرتے ہیں اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں نے بومیرینگ کا ہتھیار بنایا جو نشانے سے چوکنے کے بعد شکاری کے پاس لوٹ آتا ہے اور کچھوے کی عمر انسان سے زیادہ ہوتی ہے اور سر کے بال مرنے کے بعد بھی کئی گھنٹے تک بڑھتے رہتے ہیں اور انسان کے جسم میں اتنی چربی ہوتی ہے کہ اگر اس کی موم بتی بنا کر جلائی جائے تو۔۔۔۔ مگر مدت ہوئی میں نے ایسی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

میں دفتر سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ سوچا کہ گھر میں بیٹھ کر ہی لکھ لوں گا۔ میں گھر کے دروازے ہی پر تھا کہ ساجدہ کی آواز آئی: "اندر آنے سے پہلے پائنداز پر جوتے رگڑ کر صاف کر لیجیے

www.taemeernews.com

گا۔" اندر آکر میں اس کی طرف بڑھا مگر وہ ناک پر دوپٹا رکھ کر فوراً باورچی خانے چلی گئی۔ "جائیے، پہلے ہاتھ منہ دھولیں، نہالیں۔ اور دیکھیے جب تک ہاتھ صابن سے خوب اچھی طرح نہ دھولیں کسی برتن کو نہ چھوئیے گا۔" وہ آئی اور ایک چٹکی سے پکڑ کر پھلوں کی تھیلی لے گئی جو میں اس کے واسطے خرید کر لایا تھا۔ سیبوں کے چھلکے پر وہ گیلا کپڑا پھیرنے لگی اور انگوروں کو پوٹاشیم پر مینگنیٹ کے تسلے میں ڈال دیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے مجھ سے پکار کر کہا۔ "کپڑے اتار کر ایک کونے میں ڈال دیں، میں گرم پانی میں ابالوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دفعہ کے دھلے ہوئے انگوروں کو دوبارہ دھونے کے لیے پانی بھرا اور تسلا ترچھا کر کے پانی نتھارنے لگی۔ انگور کے دانے سرخ ہو رہے تھے اور بیسن دانی میں سرخی مائل پانی بہہ رہا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ جب میں لکھنے بیٹھا تو میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ آسمان سیاہ پڑ چکا تھا۔ شہر کی عمارتیں تاریکی کے دھبوں میں بدل چکی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ میں اندھیرے میں گھورتا رہا۔ میرے سامنے سادہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میں اس پر کیا لکھوں، کیسے لکھوں۔ کسی طرح یہ کاغذ میرے الفاظ کا زہر چوس لے اور آسمان کا جیسا سیاہ پڑ جائے۔ میرے لفظ بولنا چاہتے ہیں مگر زمین پر خاموشی اور سکوت طاری ہے۔ ہر چیز مردہ لگ رہی ہے۔ بلکہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکی ہے۔ صرف ایک ہی موضوع ہے جس پر لکھا جا سکتا ہے، جس پر سوچا جا سکتا ہے۔ آخری اور انتہائی موضوع۔۔۔۔ موت۔ لیکن اس کے لیے اتنے سیاہ الفاظ کہاں سے لاؤں۔ اس اندھیرے سے۔ میرے چاروں طرف جو اندھیرا ہے میں اس پر لکھوں گا۔ میں نے اٹھ کر بتی بجھا دی۔ میں اندھیرے میں لکھوں گا۔ میں گھپ اندھیرے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ نہ الفاظ ایک کے اوپر ایک ہوتے ہیں نہ سطر کی ترتیب بگڑتی ہے۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ میں نے بہت سی چیزیں اندھیرے میں لکھی ہیں۔ میں یہ اداریہ بھی اندھیرے میں لکھوں گا۔ ایک دم سے خیال آیا کہ اداریہ نہیں، مجھے "مانیں یا نہ مانیں" کا فیچر لکھنا ہے۔ بتی بجھا کر میں نے لکھنا شروع کیا۔ "اسرائیل کے قریب ایک جھیل ہے جس کا نام بحیرۂ مردار ہے، اس کے کھاری پانی میں یہ خاصیت ہے کہ وہاں کوئی زندہ چیز پنپ نہیں سکتی۔ نہ آبی پودے، نہ مرغابیاں، نہ مچھلیاں، اسی لیے اسے بحیرہ مردار کہتے ہیں۔۔۔۔

۱۹۸۴

ooooo

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ستارۂ غیب

www.taemeernews.com

*

میز پر بساط بچھی ہوئی تھی، ہم چاروں اس کے گرد جمع تھے اور بازی شروع ہونے والی تھی۔ یہ ہمارا روزانہ کا معمول تھا۔ ہم رات کے وقت کھیلتے تھے، کیوں کہ دن میں اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوتی تھیں۔ اپنا دن ہمیں دنیا کو دینا پڑتا تھا تب کہیں جا کر رات آزاد ملتی تھی کہ اپنی اندرونی خواہشات کے مطابق تھوڑی دیر جی لیں۔ دفتر کا کام نمٹانے اور بچوں کو سلا دینے کے بعد یا تو وہ ہمارے ہاں چلے آتے یا ہم دونوں ان کے ہاں چلے جاتے۔ یہ ایک قسم کی عادت سی بن گئی تھی، جو روز بروز پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو ایک دوسرے کو دیکھ کر کچھ کہنے سننے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی، جمع ہوئے اور کھیل شروع۔ بلکہ ہم چاروں اکٹھے ہی اس کھیل کے لیے ہوتے۔ ہمیشہ ہم چاروں، کوئی اور نہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب سی لگتی تھی۔ ایک پڑوسی نے ہمیں دیکھ کر زیر لب کہا: شادی شدہ جوڑوں کے کھیل۔ کسی اور نے اعتراض کیا کہ یہ بچوں کا کھیل ہے۔ مگر ہم ہمیشہ پوری سنجیدگی سے کھیلتے تھے۔ ہمارے لیے یہ کھیل زندگی سے بہت قریب تھا۔ کچھ زیادہ ہی۔ شاید ہم کھیلتے بھی اس طرح تھے جیسے زندگی گزار رہے ہوں۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا۔

کھیلنے کا بورڈ میز پر بچھا دیا گیا تھا، اور آتے ہی ہم نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں، جو پہلے سے مقرر ہو چکی تھیں۔ ہم لوگ سمتوں کے حساب سے بیٹھتے تھے۔ یاسمین شمال میں، جنوب میں خالد، مغرب میں نجمہ اور مشرق کی جانب میں۔ پارٹنرز کے بارے میں ایک بات طے تھی۔ وہ یہ کہ میاں بیوی پارٹنر نہیں ہونے کے۔ یہ تجویز خالد نے پیش کی تھی۔ ہنستے ہنستے اسے مان لیا گیا تھا۔ کیوں کہ اس سے کھیل کی دل چسپی اور سنجیدگی میں اضافہ ہوتا تھا۔ اب یاسمین خالد کی پارٹنر تھی اور نجمہ میری۔

پہلی بازی شروع ہونے سے پہلے خالد نے نجمہ سے کہا تھا "دیکھو ان سے چپکے چپکے سازش کر کے اشارے نہ کرنے لگنا۔ یہ تاش کا کھیل نہیں ہے"۔

"اشارے؟.... کیسے اشارے؟ میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ میں کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ جیسے کسی نے میرے چھپے ہوئے خیال کو پڑھ کر سب کو بتا دیا ہو۔

جواب میں خالد ہنس دیا۔ "پارٹنرز کے آپس کے اشارے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ یہ سلیپنگ پارٹنرز تو نہیں ہیں"۔ اس نے ہنستے ہوئے یاسمین کی طرف دیکھا جواب اس کی پارٹنر تھی۔ یاسمین چپ رہی، مگر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یاسمین کی یہ خاص بات تھی کہ وہ جب بھی جھینپ جاتی تھی، اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو جاتا تھا۔ چنار کی کلیوں کی طرح۔

اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میں مسکرا دیا جیسے وہ میری بیوی نہ ہو، پھولوں سے لدا ہوا

www.taemeernews.com

پیڑھو۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ اپنا ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ویسے یہ پارٹنرز بھی محض دل لگی کے لیے تھے۔ اس کھیل میں پارٹنر ہونے سے کوئی فرق تو پڑتا نہیں تھا۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ کھیل کی بساط پر ہر کھلاڑی اکیلا تھا۔

ہمیشہ کی طرح پہلا پانسا میں نے پھینکا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں مشرق میں بیٹھا تھا۔ لیکن سمت سے کیا فرق پڑتا تھا؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جب تک کہ چھ کا ہندسہ نہ آجائے، میں اپنی گوٹ گھر سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ انتظار کرتے کرتے مجھے وہ ہندسہ پراسرار معلوم ہونے لگا اور اس نیم طلسمی عدد کے ورود کی راہ تکتے تکتے میں وہ نوٹ ترتیب سے رکھنے لگا جو مجھے کھیل کے شروع میں ابتدائی سرمائے کے طور پر دیے گئے تھے۔ میں نے پانچ پانچ، دس دس، پچاس پچاس اور سو سو روپوں کی گڈیاں بنا کر رکھ لیں۔ یہ کاغذ کے چوکور ٹکڑے تھے جن پر بابائے قوم کی تصویر بھی بنی ہوئی تھی، یہ عبارت بھی درج تھی کہ "رزقِ حلال عین عبادت ہے"۔ اصلی نوٹ سے فرق تھا تو صرف اتنا کہ جہاں لکھا ہونا چاہیے تھا "حکومت پاکستان"، وہاں لکھا ہوا تھا "کروڑ پتی بیوپار"۔

کھلاڑیوں کے لیے چار نشان تھے۔ گھڑسوار، بادبانی کشتی، مینار اور نیم دراز ببر شیر۔ دھات کے بنے ہوئے یہ چھوٹے سے کھلونے، جو بہت مہارت سے بنائے گئے تھے، پانسے پر آنے والے ہندسے کے حساب سے گھر چلتے تھے۔ پہلے ہی دن سے گھڑسوار میرا نشان تھا۔ میں اس کو ہاتھوں میں گھما رہا تھا، اور اس ہندسے کا انتظار کر رہا تھا جو میرے لیے سفر کی راہ کھول دے۔ باقی تینوں کے نشان باہر نکل آئے تھے اور خانے پھلانگ پھلانگ کر چل رہے تھے۔ میں مایوسی اور بے چینی کے عالم میں انہیں چلتے اور آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت سارے خانے خالی تھے اور جو وہاں پہنچ کر اپنا نشان رکھ دے، اس کے ہوسکتے تھے۔ ہر خانہ مجھے ایک نادریافت خطے کی طرح لگ رہا تھا، جو اپنے سیاح کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہو کہ اپنا پہلا قدم وہاں رکھے اور اپنے نام پر اس کو تسخیر کرلے۔ میں زیادہ سے زیادہ خانے اپنے واسطے حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر جب تک پانسے پر چھ نہ آجائے، میں پہلے خانے سے باہر نکلنے پر مجبور تھا۔ ان لوگوں نے علاقے خریدنے شروع کردیے تھے اور جس وقت باقی کھلاڑی اپنے اپنے رنگ کے سیٹ مکمل کرنے اور تکمیل شدہ سیٹ والے علاقوں پر گھر اور دوسری تعمیرات کھڑی کرنے کے ارادے کر رہے تھے، میں اس وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوا پانسے کے گھماؤ میں بدلتے ہوئے ہندسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بہت سارے ہندسے دیکھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندسوں کی مختلف تراکیب میں کوئی گہری معنویت پنہاں ہوتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔ چھ کا ہندسہ بہت دیر میں آیا۔ میں نے چھ خانے گنے اور چھٹے پر اپنا گھوڑا رکھ دیا۔ اس خانے پر نام لکھا ہوا تھا کینٹ اسٹیشن، میں جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔ یہ مقام مجھے یوں بھی پسند تھا، اس لیے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ میرا گھوڑا اس پر

www.taemeernews.com

ٹھہرا اور یہ میری ملکیت ہو جائے گا۔ اس خانے پر ریل کے انجن کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میری ایک عجیب سی عادت تھی کہ مجھے کبھی فرصت ملتی تو میں کینٹ اسٹیشن جا کر لوگوں کے چہرے دیکھا کرتا تھا۔ بڑے بڑے ریلوے اسٹیشن مجھ پر ایک آسیبی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اب یہ مقام مجھے مل رہا تھا، کھیل ہی میں سہی۔ میں نوٹ گننے لگا، مگر نجمہ نے روک دیا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیشن کی ٹائیٹل ڈیڈ تھی۔ وہ وہاں مجھ سے پہلے آچکی تھی اور اس کو خرید چکی تھی۔ وہاں رکنے کے لیے مجھے کرایہ ادا کرنا پڑا۔ یہ ابتدا مجھے اچھی نہیں لگی۔ جیسے میرے ساتھ دھوکا ہوا ہو۔

اس سے پہلے ہم نے لفظ بنانے والا کھیل بھی کھیل کر دیکھا تھا۔ مگر الفاظ عین وقت پر دغا دے جاتے تھے۔ میرے پاس جو حروف آتے تھے ان سے کوئی لفظ نہیں بنتا تھا، اور جو لفظ مجھے آجاتا اس کے حروف پاس نہیں ہوتے تھے۔ لفظوں سے کھیلنا یوں بھی مشکل کام ہے۔ کبھی کبھی ہم سانپ اور سیڑھی کا کھیل بھی کھیلتے تھے۔ جس کھلاڑی کی گوٹ سیڑھی والے گھر پر آجاتی وہ سیڑھی چڑھتا ہوا اوپر والی قطار میں پہنچ جاتا۔ میری گوٹ میں جانے کون سا چکر بندھا ہوا تھا کہ سیڑھیاں اس سے دور رہتی تھیں۔ جب میری گوٹ سانپ والے خانے پر پہنچتی (اور میری گوٹوں کی یہ عادت تھی کہ سانپ کی نظر میں آئی ہوئی مسحور چڑیا کی طرح وہ سانپ کی طرف کھنچی چلی جاتیں، گوٹ ادبدا کر سانپ والے گھر پر پہنچی اور سانپ نے اسے نگل لیا) تو سانپ کے ساتھ نیچے کھسکنا پڑتا۔ سانپ کی دم کے ساتھ نیچے اترتے ہوئے دل میں ایک ہول سا اٹھنے لگتا، جیسے اونچی پینگ بھرنے کے بعد جب جھولا پلٹتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو باور کراتا تھا کہ یہ محض لوڈو کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، اس کا انحصار اندھی قسمت پر ہے ہوشیاری پر نہیں۔ اسی لیے سانپ اور سیڑھی تو کم، مگر یہ کھیل ہم پابندی سے کھیلتے تھے۔ اب بازی رنگ پر آچکی تھی۔ ہم کھیل بھی رہے تھے اور مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔ یہ فقرے بازی یا تو اس جگہ کے بارے میں ہوتی جو کسی کھلاڑی نے حاصل کی تھی یا اس کی چلی ہوئی چال کے متعلق۔ ان میں سے کئی فقرے باسی ہو چکے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو کہے جانے سے بھی پہلے معلوم ہو جاتے تھے۔ مگر کہنے والا پھر بھی کہتا ضرور تھا۔ کھیلنے کا بورڈ، جو ردی سے تیار کیے جانے والے گتے کا بنا ہوا تھا، کسی دیسی کمپنی نے برطانیہ کے مشہور MONOPLY کے انداز میں بنا دیا تھا۔ اس میں جگہوں کے نام مقامی رکھے گئے تھے۔ کھیل میں مزہ اسی لیے زیادہ آتا تھا کہ یہ نام جانے پہچانے تھے۔ اس بات پر نجمہ بچوں کی طرح خوش ہوتی تھی۔ وہ فوراً دہرانے لگتی "دیکھو، دیکھو، میں نے طارق روڈ خرید لیا ہے" اور اس کی آواز میں ایسی خوشی چھلکی پڑتی تھی جیسے وہ ساری چمکتی دمکتی دکانیں، ان میں بھری ہوئی شاپنگ، گاڑیوں کا ہجوم اور وہاں گھومنے والے لوگ سب اس کو مل گئے ہوں، یا "کیماڑی میری ہو گئی ہے، اب بندرگاہ بھی میری اور سمندر کے جہاز بھی میرے"۔

www.taemeernews.com

اس کی یہ خوشی بعض دفعہ احمقانہ معلوم ہوتی تھی۔ اس بورڈ کا ہر خانہ شہر کا ایک علاقہ تھا۔ ہمیں یہ علاقے خرید کر ان پر مکان، ہوٹل، بازار اور کارخانے تعمیر کرنے تھے (لکڑی کے ہرے گنبد مکان تھے، گلابی ہوٹل، نیلے والے بازار اور لال کارخانے)، اپنے خانے پر آنے والے دوسرے کھلاڑی سے کرایہ وصول کرنا تھا۔ وہ اپنی دولت میں اضافہ کر کے دوسروں کا دیوالہ نکالنا تھا۔ یہ سارا کھیل تھا۔ کھیل کے دوران وہی نام آتے تھے جو ہم روزانہ سنتے ہیں، وہی جگہیں جو سب کی دیکھی بھالی ہیں ..... گلشن اقبال، منگھوپیر، باتھ آئی لینڈ..... ان کو خریدنے، بیچنے اور ان میں عمارتیں کھڑی کرنے کے خیال سے بہت مزہ آتا تھا اور ایک طرح کا احساسِ قوت بھی۔

اس وقت تک میں دو ہی علاقے خرید سکا تھا..... پیر کالونی اور ناظم آباد۔ اور یہ دونوں کسی لحاظ سے بھی اعلا درجے کا انویسٹمنٹ نہیں تھے۔ کھیل کے لحاظ سے بھی نہیں۔ مگر میں نے خریدے اس لیے تھے کہ میں خاص طور پر وہ علاقے خریدنا چاہتا تھا جہاں میں رہ چکا ہوں۔ ایسا علاقہ اگر دوسرا کھلاڑی خرید لے تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ مگر میرے پاس انتخاب کی گنجائش کم تھی۔ میں کھیل میں بہت دیر سے شامل ہوا تھا۔ ڈیفنس سوسائٹی اور کلفٹن بک چکے تھے، بہادر آباد میں یاسمین نے ایک شاپنگ پلازا بنا ڈالا تھا، اور فیڈرل بی ایریا خالد کے ہاتھوں میں تھا۔ خریدنے کے لیے بچا بھی کیا تھا کھارادر، ایمپریس مارکیٹ، ملیر کا پل اور ایسے ہی دو چار علاقے۔ میرے پاس نقد رقم بھی زیادہ نہیں تھی۔ میرا گھڑسوار بار بار میرے کھلاڑیوں کے خریدے ہوئے علاقوں میں جا پہنچتا اور مجھے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ میرا دھیان کھیل کی طرف سے ہٹنے لگا۔ اب کمرے میں خاموشی تھی۔ اور دھیمی بتی کی وجہ سے نیم روشن اندھیرا۔ ہمارے بیچ میں رکھے ہوئے سفید رنگ کے بورڈ پر روشنی تھی، جو منعکس ہو کر ہمارے تاریک چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کھیلنے کا بورڈ نہیں، OUIJA بورڈ ہے جس کے گرد جمع ہو کر ہم روحوں کو بلانے کا عمل کر رہے ہیں۔ دھندلی روشنی ایک لمحے کے لیے چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ٹیلی وژن کھول رکھا ہے۔ ٹی وی اس وقت کھولا گیا تھا جب ہم ان دونوں کے آنے اور کھیل شروع ہونے کے انتظار میں تھے۔ خالی گھر میں ٹی وی چل رہا ہو تو لگتا ہے گھر میں لوگ ہنس بول رہے ہیں۔ خالی کمرے آوازوں سے بھر جاتے ہیں۔ مگر ٹی وی کی آواز میں نے بند کر دی تھی۔ گونگی تصویریں اسکرین پر لرز رہی تھیں۔ آواز اس وقت بند کی گئی تھی جب خبریں شروع ہوئی تھیں۔ مجھے یہ دیکھنا تو یاد ہے کہ خبریں پڑھنے والی عورت نے ناظرین کو سلام کیا، ملک کا معیاری وقت بتایا، مگر سرخی کیا جمائی اس کی مجھے خبر نہیں۔ اس وقت تک ساری سرخیاں ایک جیسی معلوم ہونے لگی تھیں۔ کھیل ایسا جما ہوا تھا کہ خبریں چلتی رہیں اور کسی نے اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ خبریں جانے کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ اب تو ٹیلیوژن کی نشریات کا وقت بھی پورا ہو چکا تھا۔ سفید اسکرین پر صلیب جیسا وہ نشان بنا ہوا نظر آ رہا تھا، جو سارے پروگراموں کے، بلکہ قومی

www.taemeernews.com

ترانے کے بھی ختم ہو جانے کے بعد دکھایا جاتا ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب یہ نشان بھی نظر نہیں آتا۔ میں نے وقت دیکھنا چاہا۔ کلائی پر بندھی گھڑی کے ہندسے چمکے۔ ان کا رنگ سبز تھا۔ ایک پراسرار، سبز گوں چمک اور پھر اندھیرا۔ بیزاری اور نیم غنودگی کے عالم میں مجھے ایک لمحے کے لیے ان سبز ہندسوں سے ڈر لگا۔ نہ جانے کیوں، مجھے وہ آدمی یاد آگیا جسے میں نے دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر دوسری سمت سے آرہا تھا۔ چلتے چلتے گرا اور دیکھتے دیکھتے مر گیا۔ سڑک پر جمع ہو جانے والی بھیڑ میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ اس کا گرنا اور گر کر ایسی گم نام موت مر جانا اتنا غیر پیچیدہ عمل تھا کہ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر میں نے وہ لمحہ دیکھا تھا جب اس کی پتلیاں پھرنے لگی تھیں۔ وہ بیک وقت یہاں بھی دیکھ رہی تھیں اور کہیں اور بھی۔ ان آنکھوں میں ایسی ہی چمک آگئی تھی۔ گھڑی کے اندر جگنو چمک رہا تھا یا یہ گزرتے ہوئے وقت کی روشنی تھی؟ پھر مجھے یاد آیا کہ گھڑی کی سوئیوں پر ریڈیم لگا ہوا ہے۔ یہ عنصر اندھیرے میں چمکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں ان اونگھتے ہوئے خیالوں سے لوٹ آیا۔ میں نے چاہا کہ اٹھ کر ٹیلی وژن بند کر دوں۔ سستی کی وجہ سے فوراً اٹھ نہیں گیا۔ ذرا دیر یوں ہی اس میز کے گرد، بورڈ کے سامنے بیٹھا رہا۔ تب میں نے وہ دیکھا تھا۔ سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ پھر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ کچھ ہے، وہاں کچھ ہے، میرا وہم نہیں ہے، تو میں نے ٹھوکا مار کر باقی تینوں کو بھی دکھایا تھا اور انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ نشریات بند ہو جانے کے نشان میں سے وہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اتنا سا دھبا، ایک منور نقطہ، وہ نقطہ بڑھ کر ایک دائرہ، پھر دائرے میں جیسے کوئی صورت۔ وہ اسکرین پر پھیل رہا تھا۔ وہ ایک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ دھندلی سی، ادھ بنی سی۔ اس کے چہرے کی جگہ ایک گڑھا تھا۔ اس گڑھے میں آنکھیں تھیں اور ہونٹ جو ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں سفید تھیں اور چہرہ سیاہ۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ ہم دیکھ سکتے تھے، سن نہیں سکتے تھے۔ الفاظ کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اور یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ہماری زبان ہی میں بول رہا ہو۔ وہ کیا بتانا چاہ رہا تھا، مجھے، ہمیں؟ دھندلی شبیہہ پانی پر بنے ہوئے چہرے کی طرح کانپ رہی تھی۔ وہ چہرہ بھی تو نہیں تھا۔ چہرے کا مسخ شدہ عکس تھا جس میں نقوش کا احساس صرف اس وجہ سے ہو رہا تھا کہ یہ اعضاء یہاں ہونے چاہیے تھے لیکن غائب ہیں۔ مگر وہ زندہ تھا۔ وہ حرکت کر رہا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔ وہ کسی آنے والے خطرے سے خبردار کر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی ایسی اطلاع دے رہا ہے جس کی تاب الفاظ نہیں لا سکتے۔ وہ کانپ رہا تھا اور کچھ بتا رہا تھا۔ پھر اچانک وہ غائب ہو گیا۔ اسکرین پر سفید لکیر ابھری، چمکی، وہ ذرا دیر تھرتھرایا، پھر بجھ گیا۔ اسکرین بالکل خالی پڑی تھی۔

کھیل رک گیا تھا۔ ہم چاروں دم بخود بیٹھے تھے۔ نجمہ نے خاموشی کو توڑا۔ اس نے کچھ کہا۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ کہا جو ہم نے دیکھا تھا۔ پھر سب بولنے لگے۔ اسی کے بارے میں۔

www.taemeernews.com

اسی کا ذکر، کیا دکھائی دیا تھا، وہ کیا ہوسکتا تھا، اس کی نوعیت اور ممکنہ اسباب گنوائے جارہے تھے۔ میں بول نہیں رہا تھا۔ میں ان کو بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے اس کی آواز میرے کانوں میں نہیں آرہی تھی۔ وہ لوگ اس ٹیلی وژن کی تصویر معلوم ہورہے تھے جس کی آواز بند کردی گئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے گھوم رہا تھا، اس ٹی وی کی طرح جس کے چینل بہت تیزی سے بدلے جارہے ہوں۔ میں نے کیا دیکھا تھا؟ یہ تو سن رکھا تھا کہ ان دنوں شہر کے موسم کی وجہ سے کبھی کبھار سمندر پار کے ایک شہر کی نشریات دکھائی دے جاتی ہیں۔ مگر مجھے یہ بھی تو معلوم تھا کہ انقلاب کے وقت بغاوت کرنے والے گروہ ایسی تنصیبات پر قبضہ کر کے اپنی نشریات شروع کر دیتے ہیں۔ نہ اس امکان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ اس کو۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس ٹی وی سیٹ نے اتفاقی طور پر کسی ایسے چینل کو پکڑ لیا تھا جو خفیہ پیغامات کی ترسیل کے لیے استعمال ہورہا تھا۔ یہ پیغام کس نوعیت کے تھے، مافیا، بین الاقوامی اسمگلنگ، زمین کے کسی نہ کسی حصے میں ہمیشہ چھڑی رہنے والی جنگ کے لیے فوجی ہدایات، یا کہیں سے کہیں بھٹکی ہوئی نشریاتی لہروں کی شعبدہ بازی؟ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ انسانی شکل ہی نہ ہو۔ بدروح، آسیب، یا ایسی ہی کوئی مافوق الفطرت مخلوق جو ان حساس آلات کی زد میں آگئی ہو۔ یہ بیرونی خلا سے آیا ہوا پیغام تو نہیں تھا؟ ہوسکتا ہے کہ کسی دور دراز ستارے کی مخلوق ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ خلا کا کوئی ایلین تو نہیں؟ اور اگر وہ اس طرح ہماری ذہانت کا اندازہ لگا کر ہمارے سیارے پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہے ہوں؟ اور اگر اس پیغام کو ہمارے علاوہ کسی نے نہ دیکھا ہو، تو؟ یہ انتہائی اہم بھی ہوسکتا ہے۔ ہمیں یہ بات ذمہ دار لوگوں کو بتانی چاہیے۔ لیکن انہوں نے ہماری بات کا یقین نہ کیا، تو پھر؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ مجھے خلا اور ستاروں کے بارے میں زیادہ معلوم بھی نہیں تھا۔ میں نے بلیک ہول کا نام سن رکھا تھا اور اینٹی میٹر کا کہ یہ کائنات میں موجود ہر شے کی نفی ہوتا ہے اور اس سے مس ہوجائے تو اسے فنا کر دیتا ہے۔ میں چند ستاروں کو ضرور پہچانتا تھا جنہیں بچپن سے دیکھتا آیا تھا، اس کے علاوہ ان باتوں سے میرا تعلق اتنا ہی سا تھا کہ میں ہر جمعرات کے اخبار میں چھپنے والے اجتماعی زائچے پر کبھی کبھار نظر ڈال لیا کرتا تھا کہ "یہ ہفتہ کیسا رہے گا"۔ وہ بھی میں نے تنگ آکر چھوڑ دیا تھا کیوں کہ اس میں ہمیشہ یہی لکھا ہوا ہوتا تھا کہ پچھلے دنوں جو ذہنی انتشار پیدا ہوگیا تھا وہ برقرار رہے گا۔ پہلے تو میں HOROSCOPE کے لفظ کو HORROR SCOPE پڑھتا تھا۔ مگر یہ خلا کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اتنی لامحدود وسعت کا، جسے نہ ناپا جاسکے نہ گنا جاسکے، تصور کرنا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ میں صرف وہی باتیں سمجھ سکتا ہوں جو میرے حواس کی گرفت میں آجائیں۔

خالد کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "تمہاری چھت پر اینٹنا صحیح رخ پر نہیں لگا ہوا

www.taemeernews.com

ہے۔ یہ اسی کی خرابی ہے"۔ اس نے پانسا اٹھایا اور پھینکا۔ چوکور پانسے کے اوپری رخ پر چھ نقطے ابھر آئے۔ کھیل پھر شروع ہو گیا۔ میں گپ چپ کھلاڑی بنا ہوا تھا۔ اپنی باری چلنے کے لیے میں نے اپنا نشان اٹھایا۔ اس کے لمس پر میں پھر چونک اٹھا، اور اسے گھورنے لگا۔ چاروں کھلاڑیوں کے نشانات تھے، جو بالکل واضح اور مکمل طور پر گھڑی ہوئی شبیہیں تھیں۔ ہم ان کو گوٹ بنا کر کھیل رہے تھے، مگر ان پر اس دنیا کے نشان ثبت تھے جس نے ان کو گھڑ کر بنایا تھا۔ میرا نشان گھڑسوار تھا۔ میں نے دیکھا کہ گھوڑے کی ٹانگیں سرپٹ دوڑنے کے انداز میں منجمد ہو گئی ہیں، اور گھڑسوار کے سیدھے ہاتھ کی انگلی اوپر اٹھی ہوئی ہے۔ کیا یہ بھی اشارہ تھا؟ مگر میں نے غور نہیں کیا۔ میں نے اپنی باری چلی اور گھڑسوار خانے پھلانگنے لگا۔ وہ منگھوپیر پہنچ کر رکا۔ میں یہ علاقہ خرید سکتا تھا۔ مجھے اب اس میں کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی تھی۔ ایک دفعہ میں نے وہاں گرم پانی کے چشمے اور مگرمچھ دیکھے تھے۔ اس وقت مگرمچھ سو رہے تھے۔ مجھے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی تھی۔ میں نے وہ جگہ خریدلی اور کاغذ کا وہ ٹکڑا لے لیا جو اس کی ملکیت ظاہر کرتا تھا۔ میں کھیل میں شریک بھی تھا اور نہیں بھی تھا۔ دوسرے کھلاڑیوں کے علامتی نشان آگے بڑھ رہے تھے۔ میرے خریدے ہوئے علاقوں پر کوئی نہیں رک رہا تھا۔ ان کے پانسے پر آئے ہوئے ہندسے انہیں ان علاقوں کے اوپر ہی سے گزار لے جاتے تھے۔ اب پھر میری باری تھی۔ میں نے پانسا پھینکا اور گھر گن کر چلنے لگا۔ میرا نشان، اس خانے پر پہنچ کر رک گیا جہاں لکھا تھا "چانس"۔ اس سے پہلے یاسمین کی گوٹ چانس پر پہنچی تھی تو اسے کارڈ ملا تھا "تمہاری سال گرہ ہے، ہر کھلاڑی سے سو روپے کا تحفہ وصول کرو"۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، میری گوٹ جب بھی یہاں آتی تھی، مجھے الٹے سیدھی کارڈ ملتے تھے۔ ایک دفعہ میرا کارڈ نکلا تھا کہ خداداد کالونی میں تم نے جو مکان بنوایا ہے، وہ ناجائز تجاوزات کے زمرے میں آتا ہے، اس کا جرمانہ بلدیہ کو دو اور اسے مسمار کرو۔ مجھے اس کھیل پر غصہ آیا تھا جس میں ایسے سارے اتفاقات میرے ہی ساتھ ہوتے تھے۔ اس مرتبہ میں نے آنکھ بند کر کے گڈی میں سے کارڈ اٹھایا۔ اس پر لکھا تھا "بغیر لائسنس گاڑی چلانے پر چالان، جرمانہ دو ورنہ جیل جاؤ"۔ میرے پاس اتنے نقد روپے بھی نہیں تھے۔ مجھے اپنے علاقوں میں سے کوئی نہ ہوئی گروی رکھنا پڑے گا۔ میں نے سوچا کہ کون سا علاقہ ایسا ہے جس کے نہ ہونے سے میرا نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے کچھ سوچ کر لالو کھیت بیچ دیا اور سب سے کہا کہ یہاں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، اس لیے یہ ASSET کے بجائے LIABILITY بن گیا ہے! اور جھوٹی ہنسی ہنسنے لگا۔ باقی کھلاڑیوں کے پاس نقدی بھی تھی اور علاقوں کی ملکیت والے کارڈ بھی۔ کیا یہ سب آپس میں طے کر کے میرے خلاف کھیل رہے ہیں؟ انہوں نے یہ سازش کرلی ہوگی کہ اس کو منوپلائز کرو تاکہ یہ پہلے ہی دیوالیہ ہو جائے۔ میں اس طرح نہیں ہارنا چاہتا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں نے کھیل چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور

www.taemeernews.com

سگرٹ سلگانے کا بہانہ کر کے باہر چلا آیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں کھڑا رہا۔ اندھیرے میں سکون تھا، ٹھنڈک تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بھی اندھیرے کا ایک حصہ ہوں۔ کائنات کا سارا اندھیرا بہتا ہوا میری طرف آرہا ہے، میری رگوں میں جاری وساری رہنا چاہتا ہے۔ میں نے اس اندھیرے کو بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہا، اس کو کڑوے زہر کی طرح سینے میں اتار لینا چاہا۔ میں نے دونوں بازو پھیلا دیے اور منہ اوپر اٹھا دیا۔ اوپر آسمان تھا، سیاہی میں ڈوبا ہوا آسمان، دور دور تک پھیلا ہوا پردۂ ظلمات جو ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں ستارے دمک رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو ہر رات اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا تھا، ستاروں کو پہچاننے کی کوشش کرتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ ان چمکتے دمکتے ستاروں کو کیا خبر کہ زمین نام کے ایک دور دراز سیارے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک گھر کے آنگن میں ایک بچہ انہیں دیکھتا ہے اور ان کی ٹم ٹم کرتی روشنی سے خوش ہوتا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوتا تھا کہ یہ ستارے اتنی دور سے ہم پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس ستارے کو پہچانوں جو بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتا ہے۔ قطب تارے کو میں کبھی نہ یاد رکھ سکا۔ اس وقت بھی وہ میری آنکھ سے اوجھل رہا۔ اس کے بجائے ستاروں کا وہ جھرمٹ نظر آیا جسے میں نے بچپن میں پہچاننا سیکھا تھا۔ جب ان ستاروں کو پہچاننا سیکھا تھا تبھی یہ سنا تھا کہ یہ جھرمٹ اصل میں سات بہنیں ہیں جو بال کھولے ہوئے ایک لاش کے گرد ماتم کر رہی ہیں۔ تب بہت حیرت ہوتی تھی یہ کس کا سوگ منا رہی ہیں، آسمان میں کون مر گیا ہے؟ پھر میری نظر اس چمکدار ستارے پر پڑی۔ بنات النعش کے علاوہ میں اس کو بھی پہچانتا تھا۔ یہ مریخ تھا، قتل اور غارت گری کا سیارہ۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ وہ قہر اور غضب کا دیوتا ہے، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں اور تلوار سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں، جس بستی میں چلا جاتا ہے اسے جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اس کی تلوار میرے سر پر ٹنگی ہوئی ہے، اس کے نتھنوں کا گرم گرم سانس میری گردن کو چھو رہا ہے۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

۱۹۸۴

○○○○○○

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

جونک

www.taemeernews.com

*

باغ کی دیوار پر ایک گیلی، چمک دار لکیر بنی ہوئی تھی۔ نہیں، ایک نہیں، کئی لکیریں، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آڑی ترچھی لکیریں۔ اور بہت لمبی لمبی۔ جیسے ان پر چلتا ہوا کوئی گیا ہو۔ میں نے پھولوں کی کیاری میں پانی ڈالتے ہوئے دیکھا تھا، اور بہت حیرت ہوئی تھی کہ یہ کس کے نشان ہیں، کس سمت جا رہے ہیں۔ باغ کی زمین میں نمک تھا۔ مسلسل پانی پڑنے سے وہ نمک دیواروں پر چڑھ رہا تھا۔ دیوار کا رنگ وہاں سے اڑ گیا تھا اور چونا جھڑتا نظر آتا تھا۔ دن میں کسی وقت اس کیاری میں سفید رنگ کا مہین مہین سفوف پڑا ہوا نظر آتا تھا۔ رنگ اترنے سے دیوار کی اینٹیں نظر آنے لگی تھیں۔ ان کی سطح ادھڑی ہوئی اور کھردری تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے بے چینی ہونے لگتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس چونا اتری دیوار پر میرے ناخن کھرچ جائیں گے، اور اس تصور سے دانتوں میں گلن ہونے لگتی۔

پانی دیتے ہوئے میں نے چمپا کے پیڑ کو دیکھا۔ مٹی اور چونے کی پتلی سی تہہ جم جانے سے اس کے پتوں پر بنی ہوئی نسوں کا جال دھندلا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس پیڑ کو پانی سے نہلا دیا۔ پانی کی موٹی موٹی بوندیں اس کے چوڑے پتوں پر پھسلنے لگیں۔ پانی کی پتلی سی دھار پتے کی لگر پر پہنچی، وہاں رک کر بوند بنی اور نیچے کے پتے پر ٹپک گئی۔ اس کے پھولوں کا اندرونی حصہ کتنے تیز رنگ کا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پھول توڑ لیا۔ یہ رنگ پھول کے سینے میں کسی شوخ خیال کی طرح رچا بسا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ لگنے سے ایک پتا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ٹہنی کے جس حصے سے پتا ٹوٹا تھا، وہاں سے گاڑھا دودھ جیسا مواد پھوٹنے لگا۔ کیا ٹہنی پتے کے بچھڑ جانے پر آنسو بہا رہی ہے؟ بچھڑنے پر ایسا ہی دکھ ہوتا ہے؟

میں نے چمپا کا پھول اپنے پاس نہیں رکھا، وہیں گھاس پر پھینک دیا۔ رات کے وقت برآمدے کی بتی بجھاتے ہوئے میری نظر دوبارہ اس پر پڑی۔ وہ ملا دلا لگ رہا تھا۔ کیا دکھ سے ایسی ہی صورت ہو جاتی ہے؟ اس کی پنکھڑیوں پر اوس پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ پنکھڑی پر ایسے نشان ہوتے ہیں جن کی رہنمائی میں شہد کی مکھیاں اور بھونرے پھول میں جمع رس تک پہنچ جاتے ہیں۔ جتنی دیر میں وہ رس چوستے ہیں پھول ان پر زرِ گل جھاڑ دیتا ہے، تاکہ وہ اسے اگلے پودے تک لے جائیں اور اسے زرخیز کریں۔ مجھے ایسا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا۔ صرف رنگ تھا۔ کھلتا ہوا زرد، چمپئی رنگ اب بھی چمک رہا تھا۔ مگر پنکھڑیوں کے کنارے بھورے ہو کر مڑنے لگے تھے۔ اور جگہ جگہ سے کترے ہوئے بھی تھے۔ میں نے وہ پھول اٹھایا اور دوبارہ پھینک دیا۔ اس کی پنکھڑیوں کو کسی کیڑے نے کھانا شروع کر دیا تھا۔

اس وقت تک رات ہو چکی تھی۔ شام کا گدلا، دور تک چھپتا اوّل رات کے یکساں اندھیرے

www.taemeernews.com

میں چھپ چکا تھا۔ دن تو گزر جاتا ہے، رات کسی طرح کاٹے نہیں کٹتی۔ صبح کے وقت کمروں میں جمع ہو جانے والی خاک دھول کی صفائی اور شام کو باغ میں پودوں کو پانی دینا، زیادہ بڑھی ہوئی ٹہنیوں کی کانٹ چھانٹ۔ مگر اس وقت کیا کروں؟ باغ سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔ گھر خاموش ہے۔ ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دونوں بچے سو چکے ہیں۔ ان کے کمرے کی کھڑکی میں اندھیرا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر رک کر سنا۔ سوتے میں ان کے سانس لینے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ اس آواز سے میری تسلی ہو جاتی تھی۔ آج نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کر جاؤں اور انہیں چھو کر دیکھوں۔ لیکن پھر یاد آیا کہ ابھی پرسوں ہی تو گڈو نے ناشتے کی میز پر بیٹھ کر کہا تھا کہ آپ رات میں بار بار ہمیں چھو کر دیکھنے کے لیے آتی ہیں، اس سے ہماری نیند اچٹ جاتی ہے۔ میں نے اپنے اٹھے ہوئے قدم روک لیے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ اپنے بے بنیاد شک مٹانے کے لیے بچوں کو پریشان کروں۔ یہ رات کے اندھیرے میں سارے گھر میں بھٹکتے پھرنا تو میری عادت سی بن گئی ہے۔

ایسے میں ان کی کمی کا بہت شدت سے احساس ہوا۔ اس وقت انہیں میرے پاس ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے وہیں سے جھانک کر دیکھا۔ گیٹ بند تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے۔ گیٹ میں نے اپنے اکیلے پن کی وجہ سے بند کیا ہوا تھا۔ وہ آتے ہیں تو کبھی گیٹ بند کر کے نہیں آتے۔ مجھے کھلا ہوا پھاٹک اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لگتا ہے اپنی تنہائی کا شکوہ کر کے آتے جاتے لوگوں کو بلا رہا ہے۔ گیٹ ہر وقت بند رہنا چاہیئے۔ مگر انہوں نے کب میری کسی بات کا خیال رکھا ہے۔ آئیں گے تو کہہ دیں گے بزنس کے کنٹریکٹ حاصل کرنے کے لیے کسی کلائنٹ سے امپورٹنٹ میٹنگ تھی۔ میں اسی دن سمجھ گئی تھی جب وہ رات گئے گھر لوٹے تھے، اور بریف کیس ایک طرف اچھالا تھا اور کوٹ دوسری طرف، پھر میری طرف دیکھا تھا۔ دیکھنے کے اس انداز پر میرا دل دھڑکا تھا۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ سونف سپاری والا پان کھائے ہوئے ہونے کے باوجود منہ سے بو آ رہی تھی، انہوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں، میں نہیں ہوں کوئی اور ہوں۔ میں نے ڈبل بیڈ پر دوسری طرف کروٹ کر لی تھی۔ اور پھر بھی وہ دہکتی ہوئی آنکھیں میرے تن بدن میں چبھتی رہیں تو مچھروں کے کاٹنے کا بہانہ کر کے چادر اوڑھ لی تھی۔ جب انہوں نے چادر ہٹائی تو ان کے ہاتھ میں کتنی غیریت تھی۔ چھونے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا۔ وہ میرے کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کر مجھے کروٹ دلانے کی کوشش کر رہے تھے اور میرا سارا جسم اکڑ کر لکڑی کے تختے کی طرح ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے خلاف گواہی دینے والی کوئی چیز میرے سامنے نہیں آنے دی، پھر بھی میں سمجھ گئی۔ جب انہوں نے پیر کے انگوٹھے سے میرا تلوا سہلانا شروع کیا، اس وقت تک میں جان چکی تھی کہ پچھلی بار اور آج کے درمیان وہ کسی دوسرے بدن سے آشنا ہو چکے ہیں۔ ان کے لمس میں اس اجنبی بدن کا

www.taemeernews.com

انانوس ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس وقت وہ مجھے میری وجہ سے نہیں چھو رہے ہیں، بلکہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ میرا جسم ان سے جھجکنے لگا۔ وہ کپڑے اتار کر میرے برابر لیٹے رہے اور میں ان کے دہکتے ہوئے ہاتھوں کے لمس کو جھٹکنا چاہ رہی تھی۔ وہ ہانپ رہے تھے۔ ان کے سینے سے لے کر ناف تک بال سانپ کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ سانس لینے میں ان کا سینہ اور پیٹ ہلتا تو ایسا لگتا کہ یہ بالوں کے گچھے نہیں ہیں، کھن کھجور ہے جس کی ہزاروں ٹانگیں ہل رہی ہیں۔ کہیں یہ گندہ، گیلا، پسینے بھرا سلسلا کھن کھجورا میرے بدن پر نہ رینگنے لگے۔ مجھے متلی ہونے لگی۔ اس کے بعد یہ بزنس میٹنگز کتنی پابندی سے ہونے لگی تھیں۔ میں ڈبل بیڈ پر اکیلی لیٹ کر یہ دیکھتی رہتی کہ سرہانے کی کھڑکی سے آنے والی چاندنی نے بستر پر اجالے کا ایک ٹکڑا بچھا دیا ہے جس میں کھڑکی کی سلاخیں اتنی صاف نظر آ رہی ہیں جیسے یہ چادر قید خانے کی دیوار ہے اور اجالے کے اس ٹکڑے نے اس میں کھڑکی پھوڑ دی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ آج کی رات بھی میں سو نہ سکوں گی۔ گھر کی ساری بتیاں بجھ چکی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سناٹا اپنی مخصوص ان جانی سرسراہٹ، ان دیکھی آہٹ سے بھرا ہوا۔ اندھیرا پنجوں کے بل رینگ رہا ہے۔ خاموشی دبے پاؤں چل رہی ہے۔ اگر میں اس کو رینگتے، کلبلاتے ہوئے چپکے سے دیکھ لوں؟ وہ پنجوں کے بل سرک رہی ہو، اور میں پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دوں۔ تب کیا وہ اس گھر کو آوازوں سے بھر جانے دے گی؟

میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے بجلی کے کھٹکے پر ہاتھ رکھا۔ بتی جلی اور ایک لمحے ہی میں بجھ گئی۔ اس کا عکس سنگھار میز کے بڑے آئینے میں یوں جل بجھا جیسے روشنی کی ایک ٹکیا آئینے کے اندھیرے میں گھل گئی ہو۔ اور آئینے میں ایک لمحے سے بھی کم مدت کے لیے چمکنے والا نیلا رنگ اندھیرے میں مل گیا۔ میں اندھیرے میں کھڑی رہی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ اتنی گہری اور دبیز خاموشی کہ صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں ٹٹولتی ہوئی آگے آئی۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی نہیں ہوئی تھیں۔ مگر کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب اتنی جانی پہچانی تھی کہ میں آنکھیں بند کیے ہوئے بھی ان کے درمیان چل پھر سکتی تھی۔ سنگھار میز کے نچلے حصے کے اندر کپڑے کا بنا ہوا گھر رکھا تھا۔ میں اس کے اندر بٹن دھاگے سوئیاں اور سینے کا سامان رکھتی تھی۔ کپڑے کے گھر میں چمنی کی جگہ دھاگے کی گٹی لگی ہوئی تھی اور ڈھلوان چھت میں سوئیاں۔ ان سوئیوں میں پروئے ہوئے دھاگے چھت سے لپٹی ہوئی بیلوں کی طرح نیچے لٹکتے رہتے۔ (گھر جیسا یہ ڈبا باجی نے بنا کر دیا تھا۔ انہوں نے کپڑے کے رنگین ٹکڑے جوڑ کر ٹی کوزی بھی بنائی تھی۔ جو دور سے یوں لگتی کہ میز پر مرغی بیٹھی ہوئی ہے اور اپنے رنگین پروں سے چائے دانی کو سینک رہی ہے۔) میں نے گھر کی

www.taemeernews.com

چھت سے سوئی نکالی۔ سوئی کے ناکے کو آنکھ کے پاس لے جا کر دیکھا۔ پاس لانے سے اتنا سا ناکا پھیل گیا۔ اس کے اندر سے نظر آنے والا اندھیرے کا اتنا ٹکڑا اس میں سے پانی کے ریلے کی طرح گزر گیا۔ سوئی کو ہلایا تو ناکے میں جڑا ہوا اندھیرا بدل گیا۔ اب اس میں چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں ناکے کو گھما کر چیزوں کو اس کے اندر سماتے ہوئے دیکھنے لگی۔ کمرے کا سارا سامان اس میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے دھاگے کا سرا اس میں پرونا چاہا۔ اندھیرے کی وجہ سے دھاگا بار بار آگے نکل جاتا تھا۔ ناکا خالی رہتا اور دھاگے والا ہاتھ ادھر ادھر بھٹک جاتا۔ میں نے زبان نکال کر دھاگے کی نوک کو پتلا کیا، اس کو ہتھیلیوں میں رکھ کر بٹ لیا اور سوئی والے ہاتھ کو بہت مضبوطی سے ایک جگہ جما کر، دھاگے اور ناکے کی سیدھ لے کر اس کے اندر دھاگا اتار دیا۔ انگلی کی پور پر سوئی بار بار چبھ گئی تھی۔ میرے پاس پہلے ایک انگشتانہ تھا، جسے پہن لینے سے انگلی پر سوئی کی نوک نہیں چبھتی تھی۔ وہ انگشتانہ کھو چکا تھا۔ مجھے یاد آیا تو اس کے کھو جانے پر بہت وہم ہوا۔ نقصان سے زیادہ یہ برا شگون تھا۔

سوئی میں دھاگا پرو لینے کے بعد میں نے بٹوے میں سے دس پیسے کا سکہ نکالا۔ سکوں کی ڈھیری میں سے اندھیرے میں ٹٹولا کہ وہ سکہ اٹھاؤں جس کے کنارے دندانے دار ہوں۔ اس کے لے کر میں بچوں کے کمرے میں گئی اور روبی کی میز پر رکھی ہوی گلک میں ڈال دیا۔ مٹی کی یہ گلک ایسے چہرے کی طرح لگتی تھی جس میں باچھیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے سوا باقی نقوش بننے سے رہ گئے ہوں۔ رات میں جب بھی میری آنکھ کھل جاتی تھی میں اندھیرے میں اٹھ کر سوئی کے ناکے میں دھاگا ڈالنے کی کوشش کرتی تھی اور جتنی بار دھاگا ڈالنے کے اس امتحان میں کامیاب ہو جاتی تھی، ہر دفعہ روبی کے گلک میں دس پیسے کا سکہ ڈال دیتی تھی۔ روبی سوتی جاگتی گڑیا کے لیے پیسے جمع کر رہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ گڑیا میں دلوا دوں گی، لیکن وہ کہتی تھی کہ میرے پیسوں سے خریدی ہوئی گڑیا اس کی کیسے ہو سکتی ہے، وہ تو میری ہو گی۔ میری بیٹی اپنے آپ کو مجھ سے الگ کرنا سیکھ رہی تھی۔ اس نے اسکول میں سیکھا تھا کہ تھوڑے تھوڑے کر کے بہت سارے پیسے جمع ہو سکتے ہیں پھر وہ رقم یک مشت مل جائے گی جو خواب کی طرح ناقابل حصول نظر آتی تھی۔ ہے ناں عجیب بات؟ ہم اس طرح خوشیوں کی ریزگاری کیوں نہیں جمع کر سکتے؟ پھر چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھرا ہوا گلک پھوڑ کر ایک بڑی خوشی خرید لیں؟

بچوں کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ اس کے سامنے بالکنی تھی۔ جسے شیشے لگوا کر بند کروا لیا گیا تھا۔ میں نے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا۔ دو مکانوں کے بیچ میں سے بڑی سڑک کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر آگے بڑی سڑک تھی۔ اس کا شور کسی وقت بھی نہیں تھمتا تھا۔ رات کے ٹریفک کی آوازیں یوں آ رہی تھی جیسے کسی ڈکراتے ہوئے جانور کے منہ

www.taemeernews.com

پر تونبی چڑھادی گئی ہو۔ ایک تیز رفتار گاڑی نے روشنی پھینکی، پھر اجالے کی اس لکیر کو سمیٹتی ہوئی گزر گئی۔ شہر رات کو بھی پوری طرح نہیں سوتا، کتے کی طرح نیند میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھتا ہے۔ کسی پرانے فلمی گانے کی دھن گونجی۔ کوئی ٹرک رات گئے لڑکھڑاتے ہوئے شرابی کی طرح پوری آواز میں ٹیپ بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔ پھر وہ آواز بھی ڈوب گئی۔ اب اندھیرے میں سے کیا برآمد ہوگا۔ گھنگھروؤں کی آواز۔ ہاں، گھنگھروؤں کی چھن چھن۔ اونٹ گاڑیوں کی ایک قطار سامان لے کر جارہی تھی۔ خاموش شہر میں گاڑی کھینچتے ہوئے یہ دیوہیکل جانور کتنے پراسرار اور خوف ناک معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھرو قدموں کے تواتر میں چھنک رہے تھے اور گاڑیوں کے نیچے لٹکی ہوئی لالٹینیں اندھیرے میں ڈول رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ منظر کسی خواب کا حصہ ہے۔ یہ سب خواب کی جزئیات ہیں، میں بھی خواب ہوں، یہ رات بھی خواب ہے، اس کی آوازیں بھی، اور یہ سب کسی نامعلوم آنکھ کی نیند میں مقید ہے۔ اگر وہ آنکھ جاگ گئی تو ہم ٹوٹ جائیں گے۔

میں زینا اتر کر نیچے آگئی۔ باہر باغ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات کو یہ سب کتنا مختلف معلوم ہو رہا تھا۔ پودے نیند میں جھوم رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف اندھیرے کے نامعلوم خطے تھے، دن کے وقت نظر نہ آنے والے کیڑوں کی آوازوں سے آباد اور اپنے اندر بہت سے بھید سمیٹے ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ان رازوں کی دہلیز پر کھڑی ہوں، میں اس اندھیرے میں اتر گئی تو سارے بھید کھل جائیں گے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں جتنی چیزوں کے پاس سے گزری، دروازے پر پڑا ہوا مونجھ کا پایا انداز، ڈرائیو وے کے گول چکنے پتھر، لان کی برابر ترشی ہوئی گھاس، کیاریوں میں لگے ہوئے پودے، مجھے لگا کہ ان کے پھول اور پتیاں، سب مجھے بلا رہے ہیں۔۔۔۔ ان سب کی ایک خفیہ اور پراسرار زندگی ہے جو مجھے خاموشی کی آواز میں پکار رہی ہے۔ یہ سب اسی زندگی کے مطابق اگ رہے ہیں، اور مجھے بھی یہ راز بتانا چاہتے ہیں۔ میں ان کے پاس جاؤں یا وہ میرے پاس آجائیں گے؟ اندھیرے میں کوئی چیز چل رہی تھی۔ پودوں میں کوئی تھا۔ میں وہیں کھڑی رہی۔ وہ سایہ اب پڑوس والے گھر میں حرکت کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں اس کی طرف جانے لگی، جیسے کوئی نیند میں چلتا ہے۔ میں دیوار کے پاس آگئی۔ یہ دیوار دونوں مکانوں کے بیچ میں تھی۔ دیوار پر وہی گیلی لکیریں چمک رہی تھیں۔ سینکڑوں گیلی، لیس دار لکیریں۔ روتے ہوئے بچے کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان کی طرح۔ اور ان لکیروں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ پڑوس کے لان میں کوئی چل رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو میں نے پہچان لیا۔ یہ صاحب ابھی چند دن پہلے ہی اس مکان میں آئے تھے۔ مجھے کھڑا دیکھ کر وہ میری طرف آنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا ہے، اور ان کا چہرہ، بڑھے ہوئے شیو کی وجہ سے ادھورے چاند کی

www.taemeernews.com

روشنی میں نیلا لگ رہا ہے۔

وہ دیوار کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے میرے بالکل سامنے۔ ان کا چہرہ نیلا تھا اور آنکھیں سبز۔

"رات کتنی رہ گئی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"آدھی سے کچھ کم"۔ انہوں نے جواب دیا۔

بولتے میں ان کے گلے کا کنٹھ اوپر نیچے ہل رہا تھا۔ گردن سے لے کر ٹھوڑی تک کھال جھلی کی طرح لٹکی ہوئی تھی۔ گردن اور سینے کے جوڑ پر ایک گڑھا تھا جو اندھیرے میں بھی سرخ نظر آ رہا تھا۔

وہ دیوار کے پاس سے لوٹ گئے۔ میں ان کو دیکھتی رہی۔ ان کے ہاتھ میں ٹین کا ڈبا تھا۔ ویسا ڈبا جو اپنے اندر آنے والی چیز کے ختم ہو جانے پر گھروں میں کچھ رکھنے، کچھ بھرنے کے کام آتا ہے۔ میرے باورچی خانے میں بھی ایسے ڈبے تھے۔ انہوں نے ڈبے میں دو چھید کر کے تار ڈال دیا تھا، اور یہ دستہ بن گیا تھا۔ وہ یہ ڈبا لے کر سارے لان میں گھوم رہے تھے۔ ان کی نظریں گھاس میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ رک کر دیکھتے اور کوئی چیز اٹھا کر ڈبے میں ڈال لیتے۔ وہ بار بار جھکتے تھے اور کچھ اٹھاتے تھے۔ کیا وہ گرے ہوئے سکے چن رہے تھے، میں نے آواز دے کر پوچھا۔

وہ ڈبا لے کر میرے سامنے آ گئے۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ یہ چمٹا ٹین کاٹ کر بنایا گیا تھا اور اس کے دونوں سرے چپٹے کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح گرفت لینے میں آسانی ہوتی ہو گی۔

دیوار کے پاس آ کر انہوں نے ڈبا میرے سامنے کر دیا۔ ڈبے کی تہہ میں کوئی گیلی گیلی کالی کالی چیز پڑی لس لس کر رہی تھی۔

میں نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"جونک" انہوں نے کہا۔

جونک؟ میرے ذہن میں ایک سوجی ہوئی ٹانگ گھوم گئی جسے دریا میں سے نکالا جا رہا ہے اور جس پر سینکڑوں جونکیں چپکی ہوئی ہیں اور اس کا خون چوس رہی ہیں، خون چوس کر پھول رہی ہیں۔

میں نے ڈبے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ کالے رنگ کی پٹیاں ہل رہی تھیں اور ان کے سروں پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ بھی ہل رہے تھے۔

"یہ جونک تو نہیں ہے"۔ میں نے اعتراض کیا۔ "یہ تو مٹی خور ہے، باغوں میں رہنے والا، پودے اور مٹی کھانے والا کیڑا، جونک تو....."

www.taemeernews.com

"یہ جونک ہے" انہوں نے میری پوری بات سنے بغیر کہا۔ "آپ کو نہیں معلوم کہ یہ کیا کرتے ہیں؟"

انہوں نے ایک پھول میری طرف پھینکا۔ اس پھول کی پنکھڑیاں کناروں سے کتری ہوئی تھیں۔ اس پھول کو دیکھ کر ایسا لگا کہ یہ سب پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں، یہ یاد نہیں آیا۔ تو یہ کیڑا پھولوں کو خراب کر رہا ہے۔ معلوم نہیں اس کا نام کیا ہے، میں نے سوچا۔

"آپ انہیں جمع کیوں کر رہے ہیں؟" ذرا دیر بعد میں نے ان سے پوچھا۔

"میں انہیں چن چن کر جمع کروں گا اور سب کو ختم کر دوں گا۔ انہوں نے میرے باغ پر حملہ کر دیا ہے اور چپکے چپکے اسے کھا رہے ہیں۔ یہ رات کے اندھیرے میں پودوں اور پھولوں کو کتر جاتے ہیں۔ میں ان میں سے ایک کو نہیں چھوڑوں گا"۔

ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں کچھ نہیں بولی۔ وہ کہہ رہے تھے: "انہیں مٹانے کے بعد ساری گھاس میں کیچوے لا کر رکھوں گا۔ کیچوا پہچانتی ہیں آپ؟ اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے، گلابی اور سرخ مٹی، اور کبھی بالکل کالا۔" وہ دیوار پر جھکے ہوئے تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے۔ "آپ کو پتہ ہے کہ کیچوا خود کفیل ہوتا ہے؟ جب اسے ضرورت ہوتی ہے، یہ بیچ سے ٹوٹ کر دو کیچوؤں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ایک حصہ نر کیچوا بن جاتا ہے اور دوسرا مادہ۔ ملاپ کے بعد دونوں رینگتے ہوئے اپنے اپنے راستے پر چلے جاتے ہیں۔ نہیں، نہیں، کیچوے سے گھن نہیں کھانی چاہیئے۔ کیچوا بے حد مفید مخلوق ہے۔ فصلوں کے لیے بہت ضروری بھی ہے۔ وہ مٹی کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے نیچے دبی ہوئی مٹی کو اوپر آ کر تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔ کیچوے پالنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں انہیں پال کر ہر جگہ پھیلا دینا چاہیئے تاکہ مٹی سانس لیتی رہے۔ اس سیارے کا دم گھٹ رہا ہے"۔

میں اب بھی خاموش رہی۔ میں نے ڈبا اٹھا لیا اور اس میں دوبارہ جھانک کر دیکھا۔ ڈبے کے اندر بجبجاہٹ ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھیئے" انہوں نے کہا اور چمٹے سے پکڑ کر ایک جونک نکالی۔ وہ بالکل سمٹی ہوئی تھی۔ اسے انہوں نے دیوار پر لگا دیا۔

"اسے دیکھتی رہیئے" وہ یہ کہہ کر اندر چلے گئے۔

جونک پھیل کر لمبی ہوئی اور اس نے دیوار پر رینگنا شروع کر دیا۔ انگلی کے برابر ایک سیاہ پٹی تھی جو دیوار پر دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اس کے سر پر ماچس کی تیلی جیسے دو چھوٹے سے سینگ نما فیلرز تھے جو ہل رہے تھے۔ جونک بہت دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس کے طے کیے ہوئے راستے پر ایک گیلی، چمک دار لکیر بن رہی تھی۔

وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں نمک دانی تھی۔

www.taemeernews.com

"اب دیکھئے" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے دھیرے گھسٹتی ہوئی جونک پر نمک چھڑکنے لگے۔ جونک چلتے چلتے رک گئی۔ وہ سمٹ کر گول ہونے لگی۔ اس کے فیلرز غائب ہوگئے اس میں سے لیس نکل رہا تھا۔

"نمک چھڑکنے سے یہ پگھل کر مرجائے گی"۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔ "یہ انہیں تباہ کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے"۔

میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کب دیوار کے پاس سے ہٹ گئے اور دوبارہ گھاس میں سے جونکیں چننے لگے۔ میں اس ایک جونک کو دیکھ رہی تھی، جس پر نمک چھڑکا گیا تھا۔ اس کی رفتار اور بھی مدہم ہوگئی تھی۔ وہ اب بھی گھسٹ رہی تھی اور اس میں سے بہت لیس نکل رہا تھا۔ لگتا تھا وہ پانی پانی ہو کر بہہ جائے گی۔ وہ دیوار کی کگر پر رینگ رہی تھی۔ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ اب وہ اتنی سی رہ گئی تھی۔ دیوار اتر کر زمین پر پہنچنے سے پہلے وہ گر پڑی۔ میں نے وہاں سے جانا چاہا، مگر قدم نہیں اٹھے۔ اب اس کے اوپر چیونٹیاں آگئی تھیں۔ میں اسے دیکھتی رہی۔ مگر میرے اوپر نمک کون چھڑک رہا ہے۔ اور یہ سارے جسم سے پھوٹتا ہوا پانی؟ کوئی مجھ پر نمک چھڑک رہا ہے اور میں گھلتی جارہی ہوں۔

۱۹۸۴

○○○○○○

www.taemeernews.com

سمندر

www.taemeernews.com

' No longer we shall be settlers.
We shall teach our daughters and sons
the language of the iguana,
And commit ourselves to disorder.
The world has failed our friends.'

Gunter Eich.

www.taemeernews.com

*

یہ افزائش کا زمانہ تھا۔ کئی دن سے مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی چیز اندر سے بتا رہی ہے کہ ان کا وقت قریب آگیا ہے، ان کے آنے کا وقت، وہ آ رہے ہیں، پانی پر چلتے ہوئے، ہزاروں آبی میل کا سفر طے کرتے ہوئے میرے ساحلوں پر لوٹ کر آ رہے ہیں، بھاری بھرکم، گابھن، چپ چاپ، ادھر کا رخ کیے ہوئے، اپنے پنکھ جیسے بازوؤں سے سمندروں کو کاٹتے ہوئے، موجوں کی گیلی چادر اٹھتے ہوئے، کسی ان جانی جبلی قوت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے وہ یہیں آ رہے ہیں، اسی ساحل کی منی پر تاکہ وہی ازلی سلسلہ دہرایا جائے جو نامعلوم وقت سے جاری تھا، جس کی تکمیل میں ان کی بقا مضمر تھی، جس کھیل میں میں بھی شریک ہونا چاہتا تھا، تماشائی کی حیثیت سے ہی سہی۔ میں ساحل پر کچھوؤں کو دیکھنا چاہتا تھا۔

میں کئی دن سے منصوبہ بنا رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب پورے چاند کی رات آئے گی اور سمندر میں مد اپنے پورے عروج پر ہوگا تو میں ساحل پر جاؤں گا اور چٹانوں کی اوٹ میں بیٹھ کر کچھوؤں کے آنے، سمندر سے باہر نکلنے، ریت میں بھٹ بنانے اور انڈے دینے کا پورا عمل دیکھوں گا۔ وہ پراسرار، جسم سے عاری قوت جسے بتلانے حیرت رکھتی تھی جو سمندری کچھوؤں کے سرد لہو میں گھنیرے سربستہ راز کی طرح شامل ہے اور موسم کی ایک آن میں اس طرح ان کے جسم پر حاوی ہو جاتی ہے کہ اس کی تکمیل کی خاطر وہ اپنے گہرے سمندروں کو چھوڑ کر خشکی پر آجاتے ہیں اور اپنی اگلی نسل انڈوں کی صورت ریت میں دفن کر کے پھر پانی میں اتر جاتے ہیں۔ میں یہ سب دیکھوں گا۔ میں یہ تفصیلات طے کر رہا تھا کہ رات ساحل پر بنے ہوئے تفریحی بنگلوں میں سے کسی ایک میں گزاروں گا، بنگلہ کسی بھی واقف کار سے رات بھر کے لیے مانگا جاسکتا ہے اور اس کی کچھ پرواہ نہیں اگر وہ اس بات کا کچھ اور مطلب سمجھے، رات کے لحاظ سے گرم کپڑے تو پہننے ہی ہوں گے اور سمندر یوں بھی ان دنوں خنک ہوتا ہے، جوتے ربر کے ہوں کہ میں نرم آواز قدموں سے چلوں اور کچھوا میری آہٹ سے چونک نہ پڑے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی چیز ان کے فطری عمل میں مداخلت کرے۔ چاہے وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔

یک بیک کچھوؤں سے مجھے دل چسپی کیوں پیدا ہو گئی تھی؟ کچھوؤں کو آتے ہوئے دیکھنے کا خیال تو پرانا تھا، کئی بار سوچا مگر مصروفیات کے دائرے سے نکلنا ہی نہ ہوا، مگر ایک دن، ایک ایسے دن جو دوسرے تمام دنوں کی طرح عام سا دن تھا، میری آنکھ کھلی تو میرے کمرے میں سمندر کی خوش بو بسی ہوئی تھی۔ پہلے میں سمجھا کہ یہ خوش بو میری بیوی کی ہے، رات میں اسے ماہواری کا لہو آیا ہے، مگر نہیں، یہ سمندر کی خوش بو تھی، واضح طور پر سمندر کی کھاری اور

www.taemeernews.com

نم خوشبو۔ کیا رات میں جوار بھاٹا یہیں ہوتا رہا تھا، میرے کمرے میں؟ میں سوتا رہا اور سمندر دبے پاؤں آیا، چڑھتا پانی ہر چیز پر چھا گیا، رات بھر ان تمام چیزوں کو اپنے گیلے پن کا حصہ بنائے رہا جو دن میں خشک اور ریتیلی رہتی ہیں، اور صبح ہونے سے پہلے الٹے پیروں پھر گیا۔ کمرے میں جیسے اس کے چھوڑے ہوئے نشان بکھرے پڑے تھے۔ آبی پودوں کے ٹکڑے، سیپیاں، ستارہ مچھلیاں، مردہ کیکڑے۔ نہیں، وہاں ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا، صرف فرش کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ابھی ابھی یہاں سے پانی اترا ہے۔ اس لمحے سمندر کی بے پناہ خواہش نے مجھے سن کر دیا۔ سمندر تک جانے، اسے دیکھنے، اسے چھونے اور اس کے نرم نرم نیلے نیلے پانیوں میں اپنا آپ گیلا کرنے کی پاگل خواہش میرے اندر کروٹیں لینے لگی۔ بستر سے اٹھ کر منہ دھونے کے لیے میں بیسن دانی کے سامنے کھڑا ہوا تو دیوار پر نصب آئینے میں میرا چہرہ موجوں کی سطح پر بنے ہوئے عکس کی طرح کانپ رہا تھا۔ جتنی دیر چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی رہی، سمندر مجھے بلاتا رہا، پیالی میں سے اٹھتا ہوا دھواں اصل میں سمندر کا کہرہ تھا۔ دفتر جانے کے لیے نکلا تو آخری سیڑھی پر.... اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں اسے دیکھ سکتا تھا، واقعی دیکھ سکتا تھا.... ایک انڈا رکھا ہوا تھا، بہت بڑا اور خاکستری مائل۔ اس کی نوک اوپر تھی۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ روشنی کے رخ سے اس کے آرپار نظر آ رہا تھا کہ اس میں کچھ ہے، کوئی چیز جو ابھی پوری طرح واضح اور متشکل نہیں ہوئی مگر اس نے ایک جسم اختیار کر لیا ہے۔ روشنی کا زاویہ بدلا تو میں نے دیکھ لیا کہ وہ کیا تھا۔ وہ شفاف جھلیوں میں لپٹا ہوا جنین تھا، کسی چوپائے کا جنین۔ لیکن وہ انسان کا بھی تو ہو سکتا تھا۔ اس مرحلے پر اتنا زیادہ فرق تو نہیں ہوتا۔ میں سیڑھیوں پر حیرت زدہ کھڑا تھا کہ وہ انڈا چٹخ گیا اور اس میں سے وہ رینگتا ہوا نکلا، بہت چھوٹا سا، مٹی ملے کاہی رنگ کا، چابی کے چھلے سے لٹکے ہوئے پلاسٹک کے کھلونوں جیسا کچھوا۔ وہ ہوا پر چلتا ہوا آیا، چلتے چلتے رکا اور الٹ گیا۔ اب وہ چپٹا تھا اور بالکل ساکت۔ اس کے چاروں پنجوں کی انگلیاں الگ الگ نظر آ رہی تھی، وہ مل کر پنکھ والے بازو بن گئیں اور وہ جو رینگتا ہوا آیا تھا تیرتا ہوا لوٹ گیا۔

میرا رکا ہوا قدم دوبارہ اٹھا۔ میں دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتا رہا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہ سچ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں آخری سیڑھی پھلانگ کر اس جگہ سے، اسی جگہ سے جہاں مجھے انڈا رکھا ہوا دکھائی دیا تھا، یوں گزر گیا جیسے ہوا میں سے گزر رہا ہوں۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ہوا کے۔ اور ہوا راستہ نہیں روکتی۔ میں نے پھاٹک کے سامنے کھڑی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھولا، بریف کیس پچھلی سیٹ پر رکھا، گاڑی اسٹارٹ کی اور دفتر کے راستے پر چل دیا۔ سڑک پر صبح سویرے کا مخصوص ہجوم تھا، سینکڑوں پیدل، ہزاروں گاڑیاں۔ میری گاڑی بھی اس متحرک قطار کا حصہ بن گئی۔ گاڑی کے پہیے سڑک پر پھسلتے جا رہے تھے، میرا دھیان کہیں اور تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مجھ سے کوئی چیز کھو گئی ہے. بہت قیمتی چیز اور مجھے اس کی بازیافت کرنی

www.taemeernews.com

چاہیئے، ورنہ میں ہمیشہ پچھتاتا رہوں گا۔ ناقابل تلافی خسارے کے شدید احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا مجھے؟ غور کیا تو خیال آیا کہ نقصان کا یہ احساس اس لمحے سے شروع ہوا تھا جب میں نے کچھوے کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے وہیں گاڑی روک دی اور جب دوبارہ اسٹارٹ کی تو اس کا رخ گھر کی جانب تھا۔

گاڑی کو غلط سمت جاتے ہوئے دیکھ کر دوسرے گاڑی والوں نے زور زور سے ہارن بجائے اور ایک آدمی نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کھڑکی میں سے سر نکالا اور چیخ کر کہا "رانگ سائڈ"۔ مگر میں اسی طرح چلتا رہا۔ میری بیوی نے مجھے ناوقت گھر واپس آتے ہوئے دیکھا اور کچھ نہیں کہا۔ وہ میرے تیزی سے بدلتے ہوئے موڈ کی عادی ہو گئی تھی۔ "آپ بھی کراچی کے موسم کی طرح ہیں"، وہ کہتی تھی۔ ایک اور دفعہ غصے کے عالم میں اس نے میری مثال جاڑے کی دھوپ سے دی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں بظاہر غنیمت نظر آتے ہوئے بھی کسی کو حرارت پہنچانے کے قابل نہیں تھا۔ شاید وہ برا نہ مانتی ہو، مگر مجھے ایک احساسِ جرم سا ہوتا تھا کہ میں اپنی اندرونی کیفیات کی خاطر گھر والوں کو نظر انداز تو نہیں کر رہا؟ اسی وجہ سے میں شادی اور گھر بار کے جھنجھٹ سے بچکچاتا تھا۔ میں اپنے خوابوں کا پابند تھا۔ پتہ نہیں کیسا شوہر اور باپ ثابت ہو رہا ہوں۔ مجھے ہر وقت اپنے آپ پر شک ہوتا تھا۔ کیا سوچتا ہو گا وہ میرے بارے میں؟ کوئی شکایت تو وہ کرتا نہیں تھا۔ چپ چاپ میری ڈیسک کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ گھنٹوں وہ وہاں بیٹھا رہتا جہاں پیر رکھنے کے لیے لکڑی کی ٹیک بنی ہوئی تھی، اور میرے پاؤں کی انگلیوں سے کھیلتا رہتا۔ اس کے نرم ہاتھوں کے لمس سے میرے تلوے میں گدگدی ہونے لگتی اور میں اپنا پیر واپس کھینچ لیتا تو پیر کا انگوٹھا سمٹ جاتا جیسے کچھوا اپنی گردن خول کے اندر سکیڑ رہا ہو۔

اس کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ میرے پاؤں سے کھیلتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک اور عجیب عادت تھی۔ وہ میرے جوتوں میں پیر ڈال کر چلتا تھا۔

جب میں چھوٹا تھا تو میں بھی اپنے ابا کے جوتوں میں پیر ڈال کر چلتا تھا۔ چلنا میں نے دیر سے شروع کیا تھا۔ بچپن کی جو پہلی واضح یاد ہے، وہ لکڑی کا گڈولنا ہے۔ اس کا رنگ لال اور سبز تھا، اور اس کے آگے چھوٹا سا پہیا لگا ہوا تھا۔ میں اس کا سہارا لے کر کھڑا ہو سکتا تھا اور اس کا ڈنڈا پکڑ لیتا تھا تو وہ آگے سرکتا تھا اور میں اس کے ساتھ ساتھ کھسکتا جاتا تھا۔ اس سے پہلے جب بھی مجھے چلانے کی کوشش کی گئی، یہی ہوا کہ جوں ہی ابا نے میرا ہاتھ چھوڑا میں گر پڑتا۔ اس کے بہت بعد میں نے اپنے سہارے کھڑا ہونا اور چلنا سیکھا تھا۔

یہ ساری باتیں مجھے یاد آ رہی تھیں مگر ان سب سے زیادہ طاقتور یہ خیال تھا کہ مجھے سمندر کے پاس جانا تھا۔ آج لازمی طور پر جانا ہے۔ میں سمندر کے لیے اتنی کشش کیوں محسوس کر رہا تھا۔ وجہ مجھے نہیں معلوم، لیکن اس دن میرے اندر سمندر کے پاس جانے کی خواہش یوں پیدا ہو

www.taemeernews.com

رہی تھی جیسے کسی بچھڑے ہوئے سے ملنے کی خواہش۔ میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور اس سڑک پر ہولیا جس کے خاتمے پر سمندر تھا۔

سڑک کے ساتھ مکانوں کے بجائے کارخانے آ گئے۔ یہ کارخانے شہر اور سمندر کے بیچ میں حائل ہیں۔ ایک مزدور بستی کے نیم پختہ، گنجان مکانوں کے آگے بجری ریتی ڈھونے والے کسی ٹرک کا ٹوٹا ہوا ڈھانچہ پڑا تھا۔ سمندری ہوا کی وجہ سے اس پر زنگ لگ رہا تھا۔ ڈھانچے کا سامنے والا حصہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ماقبل تاریخ کے کسی دیوقامت حشری حیوان کا جبڑا۔

کارخانوں سے آگے نکلتے ہی ہوا بدلنے لگی۔ میں نے کھڑکی کھول کر ہوا کو سونگھا۔ میں ہوا کو سونگھ کر آنے والے موسم کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جانوروں کی اس جبلت پر مجھے رشک آتا ہے۔ اس وجہ سے زمین پر ان کا قیام زیادہ مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ ہوا میں نومبر کی نرم خنکی گھلی ہوئی تھی، کراچی کا نومبر جب دوپہر کی دھوپ میں پھیکی پھیکی تپش ہوتی ہے اور رات میں ٹھنڈک، ہوا چلتی ہے تو موہوم خواہشیں جاگنے لگتی ہیں۔ سڑک کے کنارے ایک پیڑ تھا جس میں کوئی پتہ نہیں تھا۔

راستے کے ایک موڑ پر گاڑی اچھلی تو شیشہ اوپر کرنے کے ہینڈل سے میری کہنی ٹکرا گئی۔ کہنی میں ٹیس اٹھی تو مجھے یاد آیا کہ کہنی کی چوٹ بیوی کی موت کا محاورہ بھی ہے۔ کیا میرے لاشعور میں کہیں یہ سانحہ بھی چھپا ہوا ہے؟ ایک نئی خلش نے مجھے پکڑ لیا۔ کہیں اس کے ساتھ میرا سلوک ناروا تو نہیں تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی ذاتی اور شخصی حیثیت کو میں نظر انداز کر رہا ہوں اور صرف اس بات کا لحاظ کر رہا ہوں کہ وہ میرے بچے کی ماں ہے۔ بچے کے ساتھ تو مجھے وابستگی کا شدید احساس تھا۔ مگر بچہ بھی تو اسی سے زیادہ مانوس ہے۔ گھر میں اس کی جو حیثیت ہے، کہیں اس کی وجہ سے تو میں اندر ہی اندر کبیدہ خاطر نہیں ہو رہا؟ ایک چھت کے نیچے رہتے رہتے ہم اجنبی تو نہیں بنتے جا رہے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے مناسب بھی تھے؟ وہ مضبوط ہے، میں کم زور۔ میں الجھا ہوا اور پریشان حال ہوں، سوچتا رہتا ہوں، اپنے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں۔ اس کو ضرورت نہیں ہے اس قسم کا لاحاصل دروں بینی کی۔ وہ بہت عملی اور واقعیت پسند ہے۔ اسے واضح طور پر معلوم ہے کہ زندگی کی روزمرہ مشکلات سے کس طرح نبٹا جائے۔ اسے جینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ مجھ سے جو توقعات اور مطالبے ہیں انہیں پورا کرنا تو کیا، قبول بھی نہیں کر سکتا۔ شاید میں جذباتی طور پر اس کا محتاج ہو گیا ہوں، شاید وہ اپنے دل میں مجھے قابل نفرت سمجھتی ہے اور ظاہری طور پر میری باتیں مان کر مجھے بہلا رہی ہو، جیسے اچانک سمندر کے پاس جانے کی یہ خواہش۔ میں نے گاڑی روک دی۔ سامنے چنگی ناکہ تھا۔ ہاکس بے تک جانے کے لیے یہاں ٹیکس دینا پڑتا تھا۔

آگے دوہری سڑک کی درمیانی پٹی میں ناریل کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ ہر پیڑ کے گرد

www.taemeernews.com

لکڑی کا حفاظتی کٹہرہ تھا جس میں یہ پیڑ ملزموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پیڑ اپنی قدرتی بلند قامتی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ ان کا رنگ پھیکا تھا۔ ان کے پتے پژمردہ تھے۔ یہ پنپ کیوں نہیں سکے؟ سڑک کے دائیں بائیں خالی میدان تھا، جہاں تک نظر جائے خالی ہی خالی، اور دور سے آتی ہوئی سمندر کی آواز۔ جنوب کے رخ، افق پر نظر آنے والے سرمئی سائے، عمارتیں اور جہاز تھے۔ کیماڑی، میں نے ان سایوں کو ایک نام دیا۔ اس سے پہلے خالی زمین اور زمین کے سرے پر دھوپ میں چمکتی، لہراتی ہوئی لکیر۔ یہ سمندر تھا۔ راستے میں مچھیروں کی ایک آدھ کچی بستی آئی تو میں وہاں رکے بغیر چلتا رہا۔ ایک بستی کے کنارے خالی میدان میں مچھلیاں پکڑنے کا جال سوکھ رہا تھا۔ اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے سمندر.... اچانک سمندر۔ مگر نہیں، پوری طرح نہیں۔ اس لیے کہ سمندر کے اتنے حصے کو چاروں طرف سے زمین نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ زمیں بند تھا۔ اس کے کناروں پر نمک کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ پانی میں سے نمک نکال لیا گیا تھا، اور وہ بند پانی سڑ رہا تھا۔ ایک اکیلی چڑیا پر مارے بغیر اڑ رہی تھی۔ میرا دل اداسی سے بھر گیا۔

سامنے سمندر یوں چمک رہا تھا جیسے صیقل کی ہوئی تلوار۔ وہ اس درندے کی طرح غرا رہا تھا جو زنجیروں سے بندھا ہوا نہ ہوتا تو بستی پر چڑھ آتا۔ سمندر پر پہلی نظر پڑتے ہیں مجھے پہلا لمس یاد آگیا۔ اس کا پہلا لمس۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، نرم نرم ہاتھوں کی گلابی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے پہلے ہی اس دنیا میں آیا تھا، چھوٹا سا، بے بس اور معصوم، باریک آواز میں روتا ہوا۔ میں نے اسے گود لیا تو میرا دل فخر و انبساط سے بھر گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو وشال اور مہان سمجھنے لگا کہ یہ چھوٹا سا انسان، اس میں رواں زندگی میرا کارنامہ ہے۔ مگر پھر میں نے اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کیا، اس قوت کے سامنے جس نے مجھ سے اس کو اخذ کیا تھا اور زندگی کے اس عمل میں میرے جسم و ذات کو محض ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

میں اکثر اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ کیسی ہوگی اس کی زندگی؟ میں اس کے لیے جو محبت محسوس کرتا تھا اس میں خوف کی اس درجے آمیزش کیوں تھی۔ مجھے اعتبار کس کا نہیں تھا، اپنا، اس کا یا وقت کا؟ مجھے خیال آیا کہ مجھے اس کو یہاں بھی ساتھ لے کر آنا چاہیئے تھا۔ لیکن شاید وہ یہاں آکر پریشان ہوتا۔ اسے گھر پر چھوڑ کر کیا میں نے خود غرضی کا ثبوت دیا ہے؟

میں اسے کلفٹن کے ماہی خانے میں بھی کئی مرتبہ لے کر گیا تھا۔ اسی پدرانہ فریضے کے جذبے کے تحت۔ میں چاہتا تھا کہ اسے سمندر اور سمندر کی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ مگر مجھے اس جگہ شدید کوفت محسوس ہوتی تھی۔ یہ کوفت حال ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ حالاں کہ کلفٹن کا ماہی خانہ اس شہر میں میری پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہوا کرتا تھا، جہاں میں زمانۂ طالب علمی سے جاتا رہا ہوں۔ وہاں کی جن دو چیزوں سے مجھے خاص طور پر کوفت ہوتی تھی، ان میں

www.taemeernews.com

سے ایک تو پانی کا وہ بڑا سا ٹینک تھا جس میں شارک مچھلی کو رکھا گیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر اندر ہی اندر کھول اٹھتا تھا کہ شارک کی ساری خون آشامی اور درندگی اس طرح پانی کے اس ٹینک میں موجود ہیں جیسے وہ بالکل بے ضرر اور نمائشی ہوں۔ ڈولفن کی طرح جو بہت جلد سدھ جاتی ہے اور تماشائیوں کے سامنے گیند سے کھیلتی ہے۔ دوسری چیز جو مجھے بہت بری لگتی تھی، وہ تھے سمندری گھوڑے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں مجھے بہت پسند تھی یہ چھوٹی سی مچھلی جس کا منہ گھوڑے جیسا ہوتا ہے، بلکہ جب اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ کلفٹن کے ماہی خانے کے لیے سمندری گھوڑے حاصل کر لیے گئے ہیں اور کراچی کے لوگ پہلی مرتبہ اس حیرت انگیز سمندری مخلوق کو دیکھ سکیں گے، تو میں اسی دن خاص طور پر انہیں دیکھنے گیا تھا۔ مجھے وہ بالکل شطرنج کے گھوڑے معلوم ہوئے تھے جو گن کر ڈھائی گھر چلتے ہیں، دو آگے اور ایک ترچھا۔ پھر میں نے ان کے بارے میں ایک باتصویر کتاب میں پڑھا کہ اس مچھلی کا نر انڈے سیتا ہے اور اپنے سینے کی جھلی میں بچوں کو پالتا ہے۔ یہ پڑھ کر مجھے دھچکا سا لگا جیسے اپنے کسی دوست کا اوچھا پن مجھ پر ظاہر ہو گیا ہو۔ اس کے بعد جب میں بچے کی انگلی پکڑے، شیشے کے اس ٹینک کے سامنے رکا جس میں سمندری گھوڑے رکھے ہوئے تھے تو مجھے ایسا لگا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جیسے وہ میری کم زور اور مجہول انفعالیت کی نقل اتار رہے ہوں۔ اس دن کے بعد سے میں نے ماہی خانے جانا چھوڑ دیا۔

اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں یہاں آ رہا ہوں تو وہ ساتھ چلنے کی ضد کرتا۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ ساتھ چلنے کی ضد کرتا ہے۔ پھر مجھے تکلیف دہ تفصیل کے ساتھ یاد آیا کہ گھر سے نکلتے وقت میں نے دروازہ کس طرح بند کیا تھا۔ سمندر تک پہنچنے کی بے قراری میں، مجھے دھیان ہی نہیں رہا کہ وہ خدا حافظ کہنے کے لیے دروازے میں کھڑا ہوا ہے۔ وہ آ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اندر کیا تو اسے نے اپنا سیدھا ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر ٹکایا ہوا تھا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا۔ وہاں اس کا ہاتھ تھا۔ دروازہ اس کے ہاتھ پر بند ہوا۔ وہ رویا بالکل نہیں۔ اس نے زور سے سسکی بھری۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بند ہوتے ہوئے دروازے نے اس کی انگلیاں بھینچ رکھی تھیں۔ میں نے فوراً دروازہ کھول کر اس کی انگلیوں کو چھڑایا، مگر مجھے معلوم تھا کہ اس کو میں نے اذیت پہنچائی ہے، میں اس کا مجرم ہوں۔ اس کی انگلیاں خون سے نچڑی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اور حرکت نہیں کر رہی تھیں۔ میں نے ہلکے سے پھونک ماری۔ خون کا دوران اور انگلیوں کا رنگ درد کی سرخ لہر بن کر واپس آنے لگا۔ اگر اس کی انگلی کٹ جاتی تو؟

ساحل کی ریت پر بیٹھا ہوا میں لکیریں بنا رہا تھا اور یہ سب سوچ رہا تھا۔ ان چٹانوں پر بیٹھ کر میں انتظار کروں گا، کچھوؤں کے آنے کا انتظار۔ یہاں کی ریت بھربھری تھی، گیلی اور

www.taemeernews.com

ٹھنڈی۔ چٹانوں کو تراش کر کسی نے سیڑھیاں بنا دی تھیں۔ جو چٹان پر بنے ہوئے بنگلے تک جاتی تھیں۔ پتھر کی ان سیڑھیوں پر پڑی ہوئی ریت ہوا سے سرسرا رہی تھی۔ بنگلے چٹانوں کی اوپری سطح پر بنے ہوئے تھے۔ سمندر نیچے تھا۔ میں اوپر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں ریت خشک تھی، کیوں کہ اسے گیلا کرنے کے لیے سمندر صرف رات گئے، چڑھے چاند کی تاریخوں میں آتا تھا، خفیہ عشق کرنے والے مرد کی طرح۔ میں جس چٹان پر بیٹھا ہوا تھا، اس کو سمندر ہر بار چھوتا تھا۔ موجوں کی سیڑھیاں چڑھتا اترتا آتا اور بکھر جاتا، لمبی زبان کی طرح چٹان کو چاٹتا، میرے پیر چھوتا اور لوٹ جاتا۔

سمندر کے سامنے بیٹھے بیٹھے مجھے ایسا لگا کہ یہ لمحہ میری اب تک کی بیتی ہوئی زندگی کا حاصل ہے۔ اس آن میں چیزوں کو نئے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ جیسے ہر بات اور ہر واقعے کا حاصل چند چیزیں ہی ہیں۔ گیلی ریت پر پیر ٹکائے ہوئے، میری نظریں سمندر کی چھوئی ہوئی اس چٹان پر جمی تھیں جس کے ایک رخ پر سیپی چپکی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر وہ تمام چیزیں بکھری ہوئی پڑی تھیں جنہیں سمندر اپنے ساتھ بہا کر لاتا ہے اور پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ چیزیں اتنی اہم کیوں ہیں۔ پتھر کی وہ چٹان، چٹانوں میں گھرا ہوا سمندر کا پانی، سیپیاں، سمندر کے پودے، مچھلی کی ہڈی، یہ سب بے حد حقیقی تھے۔ ایک ایسی حقیقت کے حامل جو مجھ سے آزاد اور بے گانہ تھی، یہ ایک مکمل اقلیم تھیں، ایک لامتناہی سلسلہ، صورتیں، ہیئتیں، ساخت، نقشے، تار و پود۔ یہ پوری کائنات تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا.... شاید میں اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں سکتا۔ کیوں کہ میرے پاس اسے بتانے کے لیے الفاظ نہیں ہیں.... کہ میں ہر چیز کو، ہر چیز کی اصل کو بہت گہرائی اور بہت شدت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بار میرا ان سے رابطہ ہوا ہے، میں سمجھ رہا ہوں، محسوس کر رہا ہوں۔

اس وقت پورا ساحل خالی پڑا تھا۔ یہ وہ وقت نہیں تھا جب شہر کے لوگ سمندر کا رخ کرتے ہیں۔ سمندر کا شان دار نظارہ صرف میرے لیے تھا، مجھ اکیلے کے لیے۔ دنیا ایسی ہی ہو گی جس وقت انسان نہیں آیا تھا۔ یا اس کے بعد ہو جائے گا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کہیں لکھا ہوا دیکھا تھا کہ انسان مٹ جائے گا، جیسے ریت پر بنا ہوا چہرہ، سمندر کے کنارے۔

کیا آخر میں یہی ہو گا؟ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔

ساحل سنسان پڑا ہوا تھا۔ آسمان میں کوئی پرندہ نہیں تھا۔ موجوں کے بننے اور بکھرنے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر اس پورے منظر میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ ہاں، کچھ گڑبڑ تھی۔ مگر کیا؟ کوئی چیز تھی جو ایسی نامعلوم، غضب ناک اور تباہ کن تھی۔ جو انسان کو مٹانے پر تلی ہوئی تھی۔ سمندری ہوا میں خطرے کی بو تھی۔ دھوپ میں چمکتے سمندر، چٹانوں میں گم ہوتے

www.taemeernews.com

ہوئے ساحل، ساحل سے ٹکرانے والے سفید سفید سمندر جھاگ اور جھاگ سے اڑنے والی پھوار سب اس خطرے کے احساس کے حامل تھے۔

مجھے پھر وہ یاد آیا۔ خطرے کی بو سونگھ کر لوگ اپنے بچوں کے ہاتھ تھام لیتے ہیں۔

اس وقت وہ میرے جوتے پہن کر چل رہا ہوگا۔ جب بھی وہ میرے جوتے پہن کر چلتا، مجھے برا لگتا تھا۔ کہیں اسے میری جیسی زندگی نہ گزارنی پڑے۔ آگے چل کر اس کا کیا ہوگا؟ اس بات سے زیادہ کہ وہ بڑا آدمی بنے، میری یہ خواہش تھی کہ وہ اس عہد کے گم نام کشتگان میں ایک اور چہرہ نہ بن جائے۔

میرے دل میں اس کے لیے محبت امنڈنے لگی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما۔ میں نے اس کے ماتھے کو چوما۔ وہیں سمندر کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا۔

ابھی کل کی ہی تو بات ہے۔ وہ تصویروں کا البم لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے گزشتہ دنوں کے ورق یوں پلٹ رہا تھا جیسے وہ ان دنوں کا حساب لے رہا ہو۔

اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھ دی۔ تصویر میں ایک لڑکا اپنے ابو کی انگلی تھامے ہوا کھڑا تھا۔ اس نے لڑکے کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ابو ہیں...." اس نے کہا۔

میں بہت حیران ہوا۔ حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ اس نے مجھے پہچان لیا، حیرت اس بات پر تھی کہ تصویر کھنچواتے وقت میں اس امکان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آنے والے دنوں میں کوئی مجھے اس تصویر میں پہچانے گا، کوئی ایسا وجود جس کا مجھ سے وہی رشتہ ہوگا جو اس تصویر میں کھڑے ہوئے دوسرے آدمی سے میرا تھا۔

"ابو کیا آپ کے بھی ابو تھے؟"

اس کے سوال نے مجھے غلیل میں رکھے ہوئے کنکر کی طرح بہت دور اچھال دیا۔ ماضی میں پہنچ کر اب میں ٹھیک اسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ لحۂ حال میں موجود ہے۔ مجھے لگا کہ اس کے اور میرے گراف ایک دوسرے کے آمنے سامنے چل رہے ہیں۔ جوں جوں اس کا گراف اوپر کی طرف بڑھ رہا ہے، میں گھٹتا جا رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرا حریف ہے۔

مجھے وہ شخص یاد آیا جو اس تصویر میں میرے ساتھ کھڑا تھا۔ میرے ابا۔ میرے بچے کے باپ کے باپ۔

میں ساحل کی ریت پر بیٹھا سمندر میں چھوٹے چھوٹے کنکر اچھال رہا تھا۔ آتے جاتے جزر و مد کے ساتھ ان کچھوں کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی تک آئے نہیں تھے، نہ اندھیرے سے پہلے آئیں گے، اور اپنے ابا کو یاد کر رہا تھا۔ کتنا اہم کردار تھے وہ میری زندگی میں، ایک ایسا مستحکم حوالہ

www.taemeernews.com

جس سے خود میرا اپنا وجود متعین ہوتا تھا، اور اب وہ محض ایک گزری ہوئی یاد بن کر رہ گئے تھے کہ کبھی کبھی یہ بھی خواب لگتا تھا کہ ایک آدمی میرا باپ تھا۔

میرے شعور اور یادوں کا آغاز بھی اس نقطے سے ہوتا تھا جب مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں ان سے الگ ایک ہستی رکھتا ہوں۔

یہ ابا ہی تھے جن کے دیے ہوئے نام پر میں نے اپنی زندگی بسر کی، جن کے بنوائے ہوئے مکان میں، جن کی منتخب کی ہوئی لڑکی کے ساتھ، جن کی پسند کے پیشے میں، میں نے اپنی زندگی گزاری۔ کبھی میرے اندر ان کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی۔ میں جان بوجھ کر ان سے گستاخی کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں میں ان سے اتنی شدید محبت بھی کرتا تھا کہ جتنی وہ خود اپنے آپ سے نہ کر سکے (کہ انہیں زندگی اپنی ناکامیوں کے ساتھ گزارنی تھی)۔ میں ان سے یوں مانوس تھا جیسے کوئی اپنے آپ سے مانوس ہو جاتا ہے۔

جب میں چھوٹا تھا تو وہ میرے بال کٹوانے کے لیے نائی کی دکان پر لے جایا کرتے تھے۔ نائی کی دکان کو دور سے دیکھ کر میں ہاتھ چھڑانا چاہتا اور وہ ہاتھ پکڑ لیتے۔ گھومنے والی کرسی پر بٹھا کر نائی مجھے سفید چادر اوڑھاتا (کیا میں مر گیا ہوں؟) اور میں روتا جاتا تو وہ بہلاتے اور نائی سے کہتے تھے "استرا ہلکے ہاتھوں سے لگانا، کہاں پر نمر بیج نہ پڑے"۔ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا ہوا وہ دھندلا منظر اب بھی یاد ہے کہ میری قمیص کا دامن کٹے ہوئے بالوں سے بھرا ہوا ہے، نائی پف سے میری گدی پر پاؤڈر لگا رہا ہے، اور آئینے کے اندر بیٹھے ہوئے وہ اخبار پڑھ رہے ہیں، سگریٹ پی رہے ہیں۔ (نہیں، میں زندہ ہوں ابھی!)

اس سے بھی پہلے، چلنے میں مشکل ہوتی تھی تو میں بیٹھ کر گھسٹتا تھا اور چمکنے والی، گھومنے والی چیزوں کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تھا۔ ابا نے مجھے چابی سے چلنے والے لٹو لا کر دیا تھا۔ وہی لٹو ایک دفعہ میں نے ان پر کھینچ کر پھینکا تھا۔ اس سے ان کی عقل داڑھ کے برابر کا دانت ہل گیا تھا۔ بہت برسوں کے بعد وہ مجھے یہ چوٹ ایک قصے کی طرح سنایا کرتے تھے۔ اس کے بعد پھر ان کے دانت ایک ایک کر کے ٹوٹنے، ان سے رخصت ہونے لگے، جیسے اس عمارت کے کرائے دار جواب رہنے کے قابل نہ رہی ہو۔

اس وقت مجھے اپنے بچپن کے ابا نہیں بلکہ ماضی قریب کے باپ یاد آ رہے تھے۔ اس وقت تک وہ میرے لیے ایک اور آدمی بن چکے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ وہ چاول ہاتھ سے کھاتے تھے، چمچے سے نہیں۔ پہلے مجھے اس پر حیرت ہوتی تھی، کیوں کہ مجھ سے ہاتھوں سے نوالہ نہیں بنایا جاتا، چاول گر جاتے ہیں۔ بعد میں ان کی یہ عادت مجھے بری لگنے لگی۔ اس وقت تک وہ میرے لیے دیوقامت آدرش کی جگہ محض ایک اور شخص بن گئے تھے، ایسا شخص جس کے رویوں پر مجھے اعتراض بھی ہوتا تھا۔ مجھے یہ عجیب سا لگتا تھا کہ وہ

www.taemeernews.com

چائے پیتے ہیں تو چسکی لینے کی آواز آتی ہے، باتیں کرتے میں ہاتھ بہت چلاتے ہیں، بات کہہ کر بھول جاتے ہیں، اور اونچا سننے لگے ہیں۔ اور اس خیال سے کہ دوسرا ان کی بات نہیں سن سکتا خود بھی چیخ کر بولتے ہیں۔ ان کی ایک اور عادت یہ تھی کہ کسی سے بات کر رہے ہیں تو بجائے اس کی طرف دیکھنے کے چہرہ دوسری طرف ہے۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ وہ اس قدیم روایت کی طرح ہیں، جس کے دو چہرے ہیں، ایک ماضی کی طرف اور ایک آئندہ کی طرف۔

بعض باتوں میں وہ دوبارہ سے بچہ بن گئے تھے۔ مٹھائی ان کے لیے بالکل منع تھی، مگر وہ چھپ چھپ کر مٹھائی کھاتے تھے۔ میٹھی چیزیں ان سے چھپانی پڑتی تھیں۔ رات کو شکر دان تالے میں رکھا جاتا تھا۔ ان پر اس طرح کی پابندیاں لگاتے ہوئے خود ہی مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے جسم کے خلیے اس شکر کے بھوک ہیں جو پہلے ہی ان کے خون میں فاضل مقدار میں موجود ہے مگر ان تک پہنچ نہیں سکتی۔

سست روی ان کے ہر کام میں کتنی آ گئی تھی۔ معمولی سے معمولی کام میں بھی ان کو گھنٹوں لگ جاتے۔ باتیں وہ مستقل بیتے دنوں اور پرانی جگہوں کی کیا کرتے تھے۔ وہ بار بار وہی باتیں دہرائے جاتے جنہیں سن کر ہم اکتا چکے تھے مگر احترام کی وجہ سے سنتے تھے۔ ابا ایک اور ملک میں، ایک اور زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

ان کی بعض عادتوں پر اس وقت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ ممکن ہے اب ان ہی باتوں کے بارے میں زیادہ تحمل کا رویہ رکھتا۔ مگر اب، انہیں میری برداشت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہی باتیں، جن پر مجھے اس وقت اعتراض ہوتا تھا، ان میں سے بعض کو میں اپنے اندر پانے لگا تھا۔ کبھی کبھی میں چونک پڑتا اور اپنے آپ کو بالکل اسی طرح بات کرتے ہوئے یا سوچتے ہوئے پاتا جس طرح وہ کیا کرتے تھے۔

بہت دنوں بعد، میں نے ان کا پرانا بکس کھول کر دیکھا تھا کہ اس میں کیڑا لگ رہا ہے۔ اس میں ان کے پرانے گرم پتلون اور کوٹ رکھے ہوئے تھے، انہیں میں نے نکال کر پہننا شروع کر دیا تھا۔ ان میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مشابہت مکمل تھی۔

آخری عمر میں ذیابیطس اور فشارِ خون نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ پہلے انہیں جو دوا ملتی تھی اس سے پیشاب بہت آتا تھا، بعد میں ان کا پیشاب بند ہو گیا تھا۔ اسپتال سے ضد کر کے وہ گھر واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے پیشاب کے لیے نلکی ڈال رکھی تھی۔ نلکی چوبیس گھنٹے پڑی رہتی تھی۔ نلکی کے لیے انہوں نے پاجامے میں سامنے سوراخ کر کے گنجائش بنالی تھی۔ اور نلکی کے ساتھ لگی ہوئی تھیلی کو ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے وہ سارے گھر میں پھرتے تھے۔ وہ بیک وقت مضحکہ خیز اور الم ناک معلوم ہوتے تھے۔ اس تھیلی میں ان کا پیشاب پڑا ہوا نظر آتا تھا۔ جب وہ چلتے تھے تو تھیلی کے اندر ان کا پیشاب ہلتا تھا۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں نے ان کا پیشاب ٹیسٹ کرنا بھی سیکھا تھا۔ پیشاب کو آگ پر رکھ کر اور ایک کیمیائی محلول کو، جس کا نام مجھے اب بھول گیا، ملانے کے بعد یہ دیکھنا پڑتا تھا کہ اس کا رنگ نیلا یا سبز ہی رہے۔ پیشاب کے رنگ کے حساب سے ہی انہیں انسولین کا ٹیکا لگتا تھا۔ یہ ٹیکا بھی میں ہی لگاتا تھا۔ دونوں بازو ٹیکے کے نشانوں سے بھر گئے تھے۔ وہ مجھے اپنا پیشاب دیتے ہوئے جھینپتے تھے۔ پیشاب لیتے ہوئے شروع میں، میں بھی ہچکچاتا تھا۔ مجھے گھن آتی تھی۔ گھن سے زیادہ کوئی اور کیفیت، جس کا نام میں نہیں جانتا۔ اس وجہ سے کہ یہ ان کا پیشاب تھا۔ مجھے ان کے دفتر کا پرانا چپراسی یاد آگیا تھا، جو ہمارے گھر میں اوپر کا کام بھی کبھی کبھار کرتا تھا، اور بات بات پر قسم کھاتا تھا کہ جو فلاں کام نہ کیا تو اپنے باپ کے پیشاب سے نہیں۔ اس وقت بھی یہ جملہ بے ہودہ معلوم ہوتا تھا۔ شاید میں جس چیز سے اب گھبراتا تھا، وہ اسی جملے کی بازگشت تھی۔

کیا مجھے اس بات پر گھن آتی تھی کہ ان کا جسم بھی تھا، جس کے اپنے حیاتیاتی تقاضے تھے، اور اسی جسم سے میرا رشتہ تھا؟ ہم لوگ جسم کی حقیقت سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ اس کو ہمیشہ غلیظ کیوں سمجھتے ہیں؟

اسپتال کی وہ شام بھی مجھے یاد تھی جب انہیں نیم بے ہوشی کے عالم میں دوبارہ داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے بستر کا سرہانہ نیچے اور پاؤں اوپر کر دیئے تھے۔ منہ میں ایک گول سی ٹیوب رکھ دی گئی کہ زبان دانتوں میں بھنچ نہ جائے۔ ان کے بستر کے پاس لکڑی کے بینچ پر میں نے پوری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزاری تھی۔ شام کو ان کا سانس اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ ایک سانس سینے میں سمانے بھی نہ پاتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا، لب اتنا دھیما ہو گیا تھا کہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ صبح ہونے والی تھی کہ میں نے دیکھا ان کے بازوں میں چڑھائی جانے والی گلوکوز کی ڈرپ بوند بوند گرنا بند ہو چکی ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلا کر لایا۔ ڈاکٹر نے ان کی آنکھوں میں روئی کی بتی پھرا کر دیکھی۔ ان کی پلکیں نہیں جھپکیں۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں بند کر دیں۔ ان کا سینہ لکڑی کے تختے کی طرح سپاٹ تھا۔ چہرے کی جلد، جس پر تل چٹے بال اگے ہوئے تھے، پھیکی اور زرد ہو چکی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ زبان پر لیس دار مادہ جمع تھا۔ ہونٹوں کے کونے سے رطوبت بہہ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے ان کے دونوں پیروں کے انگوٹھے باندھ دیے۔ ایک پٹی جبڑے کے نیچے باندھ دی گئی۔ ان کی ناک سے آکسیجن کی نلکی بھی نکال دی گئی۔ آکسیجن کے سلنڈر کے ساتھ ایک بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ اس میں سے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔ بستر کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیلی میں پیشاب بھرا ہوا تھا۔ نلکی کی ایک حصہ اس غبارے کی طرح تھا جس میں ہوا نہ بھری گئی ہو۔ ڈاکٹر نے اس میں سرنج گھونپ دی۔ سرنج پانی سے بھر گئی اور نلکی ان کے لنگ سے پھسلتی ہوئی باہر آنے لگی۔ ایک طرف کو ڈھلکا ہوا

www.taemeernews.com

لنگ مردہ چڑیا معلوم ہو رہا تھا۔ اس پر اکھڑے ہوئے پلاسٹر کا نشان بھی تھا۔ نلکی باہر آ گئی تو لنگ کا سوراخ، جو پھیل گیا تھا، مردہ چڑیا کی کھلی ہوئی چونچ معلوم ہو رہا تھا۔

مجھ سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ میں نے ان پر چادر ڈال دی۔ تب یک لخت میرے اندر آنسوؤں کے سمندر نے یورش کی۔

اس کے بعد سے ایک اور ہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لاش .... ہاں وہ جو میری پیدائش کا ذمہ دار تھا محض ایک جسم بن کر رہ گیا تھا، بے جان جسم جس سے گھن آ رہی تھی .... لاش کے اسپتال سے لے جائے جانے، لوگوں کو اطلاع دینے، قبرستان میں جگہ حاصل کرنے، قبر کھدوانے اور جنازے کا بندوبست کرنے کے انتظامات میں میکانکی طور پر یہ سارے کام کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ ایک غم انگیز سانحے اور ذاتی صدمے کے بجائے کسی تقریب کا سا موقع بنتا جا رہا ہے جس کے لیے بھاگ دوڑ اور اہتمام کرنا پڑ رہا ہے۔ باقی کی تفصیل میں بھول چکا ہوں، یہ ضرور یاد ہے کہ جنازے کو کندھا میں نے دیا تھا، لاش کو قبر میں اتارنے کے بعد جب مٹی ڈالی جا رہی تھی تو میں نے بھی دو مٹھیوں میں مٹی بھر کے پھینکی تھی اور اس کے بعد دیر تک پلکیں جھپکتا رہا تھا جیسے وہ دو مٹھی مٹی میری آنکھوں میں کھٹک رہی ہو۔ ہاں مجھے وہ میت گاڑی بھی یاد ہے جس میں جنازہ گھر سے قبرستان لے جایا گیا تھا۔ جس وقت یہ مسئلہ اٹھا تھا کہ جنازہ کیسے جائے گا، اس وقت کسی کو، یہ یاد نہیں کیسے، خیال آیا تھا کہ ایک تنظیم ہے جو میت گاڑیاں کرائے پر دیتی ہے۔ اس کے دفتر ٹیلی فون کر کے یہ گاڑی منگوائی گئی تھی۔ یہ دراصل ایک بس تھی جس میں چند مسافروں کی سیٹوں کے علاوہ جنازہ رکھنے کی جگہ تھی۔ باہر کے رخ پر اس نیم مذہبی نیم سیاسی جماعت کا نام سبز اور نیلے حروف سے لکھا ہوا تھا جس کی یہ گاڑی تھی۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگنے کے بعد اس تنظیم کی بس یہی سرگرمی رہ گئی تھی کہ وہ جنازوں کے لیے لوگوں کو میت گاڑیاں فراہم کرے۔ اس کا نام بھی صرف ان ہی میت گاڑیوں پر لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے شہر میں ایسی کئی گاڑیاں چلتی ہوئی دیکھی ہیں مگر ان میں سے کسی میں بیٹھنے کا اتفاق اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

ایک اور آخری یاد۔ جب ان کا چہرہ آخری دفعہ دکھایا جا رہا تھا تو کھال کا رنگ سبزی مائل ہو گیا تھا۔ اس وقت انہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں اس شخص سے مشابہت بہت کم ہے جسے میں جانتا تھا بلکہ اس کیفیت کا کوئی نام ہے، کوئی مثال ہے جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اتنے برسوں کے بعد وہ شکل اور وہ کیفیت مجھے یاد آئی، سبزی مائل مردنی کی گم نام یاد۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جو نام اس وقت یاد آتے آتے رہ گیا تھا، وہ کچھوا تھا، کچھوا۔ انہیں دیکھ کر مجھے کچھوا یاد آ رہا تھا، کچھوا جس کا خول ٹوٹ چکا ہو، جو اب اپنی گردن سکیڑ کر دیکھنے والی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔

www.taemeernews.com

ایک دفعہ ایسا کچھوا میں نے ساحل کی ریت پر پڑا ہوا بھی دیکھا تھا۔ اس کا صرف خول رہ گیا تھا، کچھوا مر چکا تھا۔ نہیں، مرا نہیں تھا بلکہ اس نے سر اور بازو اندر سمیٹ لیے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا صرف خول ہی خول نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آیا تھا کہ کسی نے اس کے بارے میں کوئی بات کہی تھی۔ کب اور کس نے، یہ تو یاد نہ رہا، وہ بات یاد رہ گئی۔ ٹانگیں اور سر سمیٹے ہوئے کچھوے کو دیکھ کر کہا گیا تھا کہ یہ سارے کا سارا درمیان ہے۔ کہنے والے نے اس کو کسی چیز سے تشبیہ بھی دی تھی۔ کاہے سے، یہ میں بھول چکا تھا۔ زندگی سے دی ہوگی۔ اس کے بھی تو دونوں سرے غائب ہیں، محض درمیان ہی درمیان ہے اور پھر ایسی گمبھیر باتیں عموماً زندگی کے بارے میں ہی کہی جاتی ہیں۔

رات ہو چکی تھی اور مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں یہ ساری باتیں سوچنے میں لگا رہا اور کچھوے کو سمندر سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔ میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ میں کسی بات کے ہونے کا انتظار کر رہا ہوں، تو اس کے بارے میں اتنا سوچتا ہوں، تیاری اتنی کرتا ہوں کہ اسے ہوتے ہوئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے۔ میں نے جب دیکھا تو کچھوا سمندر سے نکل آیا تھا۔ سمندر اور آسمان، مل کر ایک ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں موجوں کا پانی چمک رہا تھا۔ سیاہ موجوں کی سطح پر جھاگ اٹھ رہا تھا۔ آج موجیں کچھ زیادہ ہی بے قرار تھیں۔ پورا چاند تھا۔ سناٹے میں موجوں کے ساحل سے ٹکرانے کی آواز گونج رہی تھی۔ چاندنی نے سمندر پر نور کا ایک راستہ بچھا دیا تھا۔ کیا وہ اس راستے پر چلتا ہوا آیا تھا، یا اس جھاگ سے اٹھا تھا؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے تو جب دیکھا تھا تو ساحل پر ایک سایہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا بے ڈول، بھاری جسم ریت پر بڑی مشکل سے گھسٹ رہا تھا۔ اب وہ رک گیا۔ وہ گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے میری موجودگی ناگوار گزر رہی ہوگی۔ مجھ سے بدکنے کے بجائے وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے میں اس کے راستے کی رکاوٹ ہوں، میں ہٹ جاؤں تو وہ ریت میں اپنا گھونسلا بنائے۔ میں چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے، کچھوے کی مادہ ساحل پر آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ پانی کے نشان سے بہت اوپر آ گئی اور ریت میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈنے لگی۔ اب وہ اپنے بازوؤں سے زمین کھود رہی تھی۔ اس کے مضبوط، پنکھ نما بازو، جن سے وہ موجوں کا ورق پلٹتی تھی، ریت ہٹا رہے تھے۔ سامنے والے بازوؤں سے اس نے ریت میں ایک گڑھا سا پیدا کر لیا تھا، جس میں اس کا بدن دھنستا جا رہا تھا۔ وہ اس گڑھے میں اتر گئی تھی اور اس کا خول ساحل کی زمین کی سطح پر آ گیا تھا۔ اس کی موجودگی کا پتہ صرف اس طرح چل رہا تھا کہ اس کے بازوؤں کی مسلسل حرکت سے ریت ہل رہی تھی۔ اس کو دیکھنے کے لیے میں اور قریب آ گیا۔ اب وہ اپنے پچھلے بازوؤں سے مٹی ہٹا

www.taemeernews.com

رہی تھی۔ اوپر کی خشک ریت کی جگہ اندر سے پانی میں بھیگی ہوئی اور جمی ہوئی مٹی نکل رہی تھی۔ ذرا سے فاصلے پر موجیں مچل رہی تھیں۔ چاندنی رات کے آسیب میں موجیں اپنے قد سے کئی کئی گنا اوپر اچھل رہی تھیں، جیسے سحر میں مبتلا ہوں۔ موجوں کے گرنے کا شور ہو رہا تھا۔ شاید وقت بھی تھم گیا تھا۔ کیوں کہ یہ منظر تو ابدی تھا۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں سہم گیا۔ آدھی رات، وحشی سمندر، چاندنی رات کا سونا پن، زمین کی تہہ میں دبکا ہوا کچھوا، صدیوں کا سکوت اور ان سب کے سامنے ایک اکیلا آدمی، میں۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا کہ میں اس غیر آباد سیارے پر ایک اکیلا آدمی ہوں، جو چٹانوں کی اوٹ میں بیٹھ کر فطرت کے اس مہیب اور طاقت ور مظاہرے کو دیکھ رہا ہے جس میں شمولیت کی ہمت اس میں نہیں۔

مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں نے دوبارہ کچھوے کی طرف دیکھا۔ اب اس طرف بالکل سکوت تھا۔ اس نے انڈے دینے شروع کر دیے ہوں گے۔ کچھ ہی دیر میں گڑھا انڈوں سے بھر جائے گا۔ مجھے خیال آیا کہ اس وقت کچھوی رو رہی ہوگی۔ کیا میں اس کی آنسو دیکھ سکوں گا؟ میں نے وہ روایت سن رکھی تھی کہ انڈے دیتے وقت کچھوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں۔ کچھوی آنسو کس لیے بہاتی ہے، جسمانی تکلیف کی وجہ، سمندر چھوڑنے کے دکھ سے یا اپنے انڈے بچوں کے خیال سے، اس سوال کا جواب بھی مجھے نہیں معلوم۔ دوسرے سوالوں کی طرح۔

کچھوی کو آنسو بہاتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ میرے سامنے وہ گڑھے میں پڑی رہی۔ میں اسے ایک عالم محویت میں نہ جانے کتنی دیر دیکھے گیا۔ رات خنک ہو چلی تھی۔ چاند ڈھل رہا تھا۔ سمندر کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ گڑھے میں کچھ ہلتا ہوا نظر آیا۔ اس کا سر باہر نکلا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ گڑھے سے باہر نکلنے لگی وہ واپس جا رہی تھی۔ اب کی بار وہ بہت تکلیف سے چل رہی تھی۔ وہ ذرا سی دور گھسٹتی، پھر رک جاتی، رک کر ادھر ادھر دیکھتی، پھر گھسٹنے لگتی۔ اس کو اتنی مشکل میں دیکھ کر مجھے خدشہ ہوا کہ وہ سمندر تک پہنچنے سے پہلے ہی دم نہ توڑ دے۔ وہ رک جاتی تو بالکل یوں لگتا کہ مر گئی ہے۔ میں اسے بہت انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد اس پھر حرکت کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ سرکنے لگتی۔ اس کے طاقتور بازو جو موجوں کو چیر کر اس کے لیے راستہ بناتے تھے، خشکی پر اس کی کوئی مدد نہیں کر رہے تھے۔ ان پر ریت اور کنکر چپک گئے تھے۔ یہ جگہ جگہ سے چھل بھی گئے تھے۔ کتنی مشکلوں سے وہ سمندر تک پہنچ ہی گئی۔ سمندر کا پانی آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھونے کے لیے آیا۔ اس نے زور سے بازو مارا اور پانی میں تیرتی ہوئی سمندر میں گم ہو گئی جہاں سے وہ آئی تھی۔

اس کے گھسٹنے سے ساحل کی ریت پر دو طرفہ نشان بن گئے تھے۔ یہ نشان سمندر پر جا کر

www.taemeernews.com

ختم ہوتے تھے۔ ان نشانات پر الٹے پیروں چلتا ہوا میں اس گڑھے تک پہنچ گیا جہاں سے اس نے واپسی کا سفر شروع کیا تھا۔ انڈے دینے کے بعد اس نے گڑھا مٹی سے ڈھک دیا تھا۔ ساحل پر اب ان نشانوں کے سوا کوئی اور ثبوت نہیں تھا کہ وہ اپنی سمندر کی دنیا سے نکل کر یہاں آئی تھی۔

اس گڑھے کی تھوڑی سی مٹی ہٹا کر میں نے دیکھا۔ مٹی میں انڈے دبے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک اٹھالیا۔ وہ ابھی تک گرم تھا۔ کچھوے کے بدن کے حرارت اس میں موجود تھی۔ گڑھے میں اس جیسے اور بھی انڈے بھرے ہوئے تھے، پنگ پانگ کی گیند جتنے، سفید کھردرے، اور پتلے چھلکے والے۔ میں سب تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہاں کوئی ستر اسی انڈے ہوں گے۔ کچھوی ایک جھول کے انڈے ریت میں دفنا کر اپنے پانی میں لوٹ گئی کہ سورج کی تپش اور زمین کی گرمی باقی کے عمل کو پورا کردیں گی۔ گرمائی کی ایک مدت حاصل کر لینے کے بعد جنین بچہ بن جائے گا اور اپنی کچلیوں سے چھلکا توڑ کر انڈے سے باہر نکل آئے گا۔ مگر سارے انڈے اپنے اس امکان کو پورا نہیں کر پاتے۔ ان میں سے کتنے ہی کتوں اور انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہوجاتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک زمانے میں کراچی کی فیشن ایبل بیکریوں میں کچھوے کے انڈے بکا کرتے تھے۔ پھر ان کی فروخت پر پابندی لگ گئی تھی۔ نہیں، یہ سمندر کی امانت ہیں، ان کو محفوظ رہنا چاہیئے۔ میں نے وہ انڈا واپس رکھ دیا اور اس پر دوبارہ مٹی ڈال دی۔

کچھوے کے یہ انڈے یہاں مٹی میں دبے رہیں گے، کچھوا انہیں بھول کر دور جا چکا ہوگا، سمندر میں اس کی زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی ہوگی، انڈوں میں سے بچے نکلے گے، اور زمین سے سمندر میں اتر جائیں گے، اس بات سے قطعاً لاتعلق کہ وہ کس انڈے میں سے نکلیں ہیں، وہ بھی اپنے آبائی سمندروں میں تیرتے پھریں گے جہاں سے ان کی ماں نکل کر انہیں جنم دینے آئی تھی۔ اس پورے سلسلے میں براہ راست جسمانی ربط کے باوجود ایک دوسرے کی قربت سے جو لاپرواہی تھی، وہ مجھے بے حد حیرت انگیز معلوم ہوئی، شاید تھوڑی سی قابل رشک بھی۔

صبح کاذب کا وقت ہوگیا تھا۔ سمندر پر چھائی ہوئی دھند کا بادل دوسرے ساحل کی طرف پرواز کرتا ہوا جارہا تھا، جہاں پر نظر نہ آنے والا شہر نیند میں غافل پڑا تھا۔ اس وقت سمندر بہت شانت تھا۔ اس کی آواز میں دھیرج تھا۔ دور کہیں ایک موج اٹھتی، سطح آب پر شکن پڑ جاتی اور وہ شکن در شکن چلتی ہوئی اس طرف بہتی چلی آتی۔ دھند کا پردہ چھٹنے لگا اور سمندر کے رخ پر ہوا چلنے لگی۔ اب موجیں اوپر اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھیں، ان کے سروں پر سفید جھاگ جھلملا رہا تھا۔ بے کراں سمندر کی دوسری نامعلوم حد سے پیدا ہوتی ہوئی، بلند و بالا سرمگیں موجیں۔ ایک کے بعد ایک اٹھتی ہوئی اور گرتی ہوئی شیشے کی موجیں۔ اور پھر اچانک ایک موج کی بالائی سطح پر ہلکی سی جھلملاہٹ، روشنی بھی نہیں، نور کا محض ایک شائبہ، روشنی کا نقطہ بڑھ کر لکیر بنتا ہوا،

www.taemeernews.com

اور وہ منور لکیر ایک موج سے دوسری موج پر پھیلتی ہوئی۔ آسمان اور سمندر جو ایک دوسرے سے مل کر سیاہی کا یکساں پردہ بنے ہوئے تھے، الگ ہونے لگے۔ دودھیا اجالا بے کراں سمندر پر تیزی سے پھیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ بادل تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے سے سورج طلوع ہو گا۔ چٹانیں اندھیرے سے نمودار ہونے لگیں۔ پاگل موجیں ان سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی تھیں۔ چٹانوں کے پیچھے زمین تھی، بے مصرف چھوڑی ہوئی زمین اور میری تنہائی۔

اندھیرے اجالے کے درمیان رکی ہوئی یہ دنیا مجھے اچانک بہت خوبصورت محسوس ہوئی۔ شاید یہ حقیقی نہ تھی، یہ کوئی خواب تھا جس میں رات اور دن، آسمان اور سمندر گھل مل کر ایک ہو گئے تھے، جس میں بیتے ہوئے دن اور خیالوں کی باتیں زیادہ حقیقی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان چیزوں سے بھی زیادہ جو نظر آ رہی تھیں۔ شاید یہ کیفیت زندگی کی اصلیت سے زیادہ قریب بھی تھی۔ نیند سے جاگتے ہوئے سمندر کے طلسم کو میں کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اب گھر چلنا چاہیئے۔ میں واپس ہونے لگا۔ گھر کا خیال آتے ہی وہ پھر سے یاد آنے لگا۔ اس کا چوڑا ماتھا، کالی بھونرا سی آنکھیں، گھنی ہوئی بھنویں اور گال کی ابھری ہوئی ہڈی .... سب یہی کہتے ہیں کہ وہ مجھ پر پڑا ہے۔ مگر وہ شوخ اور چلبلا کیوں نہیں ہے، جیسے اس کی عمر کے دوسرے بچے ہوتے ہیں؟ میں نے خود سے سوال کیا اور جھنجھلا گیا۔ وہ خاموش رہتا تھا اور اس کا کالی کالی آنکھوں میں ان گنت سوال بھرے رہتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھتا تھا، حساس بہت تھا اور اکثر بیمار رہا کرتا تھا، اس کا چہرہ ایک بار پھر میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرے جوتوں میں پیر ڈالے ہوئے چل رہا ہے۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر میری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اسے میرا مزاج اور میری طبیعت ورثے میں ملی ہے، کہیں اسے میری جیسی زندگی بھی نہ گزارنی پڑے۔ میں نے سوچا اور میں کانپ گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ احساسِ جرم کی شدت سے میں نے گردن جھکالی۔

اس لمحے میرے پیر کے پاس سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی چیز رینگتی ہوئی میرے پیر کے پاس سے نکلی۔ میں نے گھبرا کر پاؤں کھینچ لیا۔ پھر میں نے نیچے زمین کی طرف دیکھا۔ وہ زمین پر رینگ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ کچھوے کا یہ بچہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے کسی نہ کسی بھٹ میں دبے ہوئے انڈوں میں سے نکل کر آیا تھا۔ اپنی پیدائش کے گڑھے سے مٹی ہٹا کر وہ اس سمندر کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی زندگی کا عنصر تھا۔ ریت پر بھٹکتے بھٹکتے وہ پانی تک پہنچ جائے گا، اور جوں ہی اس کے بدن کا پانی سے پہلا لمس ہو گا، وہی سمندر کا پانی جس کے لمس کا ذائقہ اس کے لاکھوں برس پرانے نسلی حافظے میں محفوظ تھا، وہ بہت تیزی سے تیرتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ ایک مرتبہ سمندر میں اتر جانے کے بعد وہ پھر کبھی خشکی پر لوٹ کر نہیں آئے

www.taemeernews.com

گا۔ صرف وہ مادہ جو اس سے ہم جفت ہو کر اس کا حمل اٹھائے گی، وہ گہرے سمندروں میں تیرتی ہوئی ایک بار پھر لوٹ کر اسی ساحل پر آئے گی جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی اور اپنے مستقبل کی امانت انڈوں کی صورت میں اس ساحل پر چھوڑ جائے گی۔ مجھے خیال آیا کہ جب سے شہر کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے ان کچھوؤں کی نسل تقریباً ختم ہونے لگی ہے جو لاکھوں برس سے سینڈز پٹ اور ہاکس بے کے ساحلوں پر انڈے دینے آتی ہے، حکومت کے ایک محکمے کے کارکن ان کے نوزائیدہ بچوں کو سمندر میں پہنچنے سے پہلے روک کر ان پر ایک نمبر اور نشانی باندھ دیتے تھے۔ میرے پاس اس کے بازوؤں میں باندھنے کے لیے کوئی نشانی نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سمندری کچھوے کا جنم چکر ہے، اور یہ چھوٹا سا کائی مائل کچھوا جو میری ہتھیلی پر سکڑا ہوا پڑا ہے، اس کا حصہ: اس کا اگلا قدم ہے۔ وہ بے ضرر اور کم زور نظر آ رہا تھا۔ کیا اسے اپنی اہمیت کی خبر تھی؟ میں نے اسے سکڑتے ہوئے دیکھا اور میرا دل اس کے لیے بھر آیا۔ مگر اسے میری ہم دردی یا خیر سگالی کی کیا پرواہ ہوگی۔ اس کی تو دنیا ہی الگ تھی۔ اس میں زندگی کی ایسی لوچدار اور اپنی جگہ مکمل شدت احساس تھی جس کا قالب بھی میری ہم دردی بلکہ میرے وجود کے لیے ناقابل حصول تھا۔ میرا جی چاہا کہ وہ میرا بچہ ہوتا۔ میں نے اسے لبوں تک لا کر چوم لیا۔ اس کا لمس میرے لیے اجنبی تھا۔ سرد اور نامانوس۔ بے حد دکھ اور ملال کے ساتھ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں اسے سمندر میں اچھالنے والا تھا، مگر مجھے خیال آیا کہ اس کے لیے ریت پر رینگنا ضروری ہے تاکہ اس میں اسی ساحل پر واپس آنے کی جبلت جاگ جائے۔ اس کے بہن بھائی سمندر کے افق پر ستاروں کی روشنی دیکھ کر پانی میں اتر چکے ہوں گے۔ میں نے اسے ریت پر رکھ دیا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی پڑا رہا۔ پھر اسے کے بازو باہر آئے اور وہ ریت پر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا سمندر کی طرف جانے لگا جہاں وہ اپنی زندگی کو جاری رکھے گا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب وہ سمندر میں غائب ہو گیا تو میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس آ گیا۔

۱۹۸۴

OOOOOOO

www.taemeernews.com

دیمک

www.taemeernews.com

*

اس مکان میں کچھ تھا، مجھے شروع ہی سے احساس تھا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو مجھے اس آدمی کا خیال آیا تھا جس کے جسم میں سینکڑوں جراثیم پل رہے ہوں، جو بظاہر چل پھر رہا ہے لیکن اندر ہی اندر کسی مہلک بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ خیال کیوں آیا تھا، اس کی وجہ میں سمجھ نہیں سکا۔ تھی کوئی ایسی بات جو ٹھیک نہیں تھی، اور یہیں اسی مکان کے اندر وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ لیکن وہ تھی کیا، اس سے میں بے خبر تھا۔ اگر کچھ معلوم تھا تو بس اتنا کہ کچھ ہو رہا ہے یہاں، کوئی ایسی چیز ہے جس کا نام مجھے نہیں معلوم، جس کو میں دیکھ نہیں سکتا، مگر جو خاموشی کے ساتھ، خفیہ طور پر بڑھتی پھیلتی جا رہی ہے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ احساس ہوتا کیسے نہیں؟ اس احساس سے بچ کر اس گھر میں رہنا بھی تو ممکن نہیں تھا۔ وہ چاروں طرف تھی، ہر چیز میں موجود تھی۔ مکان کا ایک ایک کونہ اس کے زیر اثر تھا۔ اس نے ساری چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کیسے؟..... یہ تو میں نہیں بتا سکتا..... میں نے اسے دیکھا ہی کہاں تھا؟ لیکن اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ یہ جو ہو رہا ہے، اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ چیزیں اندر سے بدل چکی تھیں۔ اسی کی وجہ سے، مجھے اب یقین ہو گیا تھا۔ یہ نظر نہ آنے والی، پھر بھی اپنا احساس دلا جانے والی اور چیزوں پر حاوی ہو جانے والی کیفیت گھر کے در و دیوار میں، تمام ساز و سامان میں اندر تک سرایت کر چکی تھی (اب یہ ناممکن تھا کہ آپ کسی بھی چیز پر نظر ڈالیں اور یہ خیال نہ آئے کہ وہ اس کے بھی پس پردہ کام کر رہی ہے) وہ کمرے کی فضا میں غبار کی طرح بھری رہتی، چھت سے مہین برادے کی طرح جھڑتی تھی۔ میں اس کو پکڑنا چاہتا تھا، مٹھی میں بھینچ کر اسے جاننا اور اس کا نام پوچھنا چاہتا تھا مگر یہ کبھی میرے ہاتھ نہ آ سکی۔ سارے گھر میں بکھری بکھری سی رہتی۔ دھوپ کی طرح۔ اداسی کی طرح۔ کسی ایک مخصوص جگہ بھی نہیں، پھر بھی ہر جگہ۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے رات کے سناٹے میں ایسا لگتا ہے کہ مکان سانس لے رہا ہے، کراہ رہا ہے، کسی ذی روح کی طرح تکلیف میں مبتلا ہے۔ دیواریں لرزتی ہیں، کنڈیاں کھڑکھڑا کر کھل جاتی ہیں، دروازے چرچراتے ہیں، چھت کی کڑیوں سے چٹخن سنائی دیتی ہے۔ سیڑھیاں آپ ہی آپ کھسکنے لگتی ہیں اور کھڑکیوں کے پٹ سہمے ہوئے دل کی طرح رہ رہ کر دھڑکتے ہیں۔ دیواروں کے سینے معلوم ہوتا تھا کہ پھٹ پڑیں گے۔ (ان میں کیا دفن تھا، کون سے راز بھرے ہوئے تھے؟)۔ چوکھٹ پر ہاتھ رکھو تو ڈھینے لگتی تھی۔ اوپر لکڑی کی پرت باریک چھلکے کی طرح برقرار تھی، اندر سے بالکل کھوکھلی۔ اس مکان میں کیا ہو رہا تھا؟ تو خود تو نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے نتائج ہر سمت پھیلے ہوئے تھے دھول کی طرح سانس کے ساتھ چڑھ رہے تھے، آنکھوں میں

www.taemeernews.com

گھس رہے تھے، تمام زندہ مخلوق اور تمام جامد اشیاء پر جمتے جا رہے تھے۔ پہلے پہل ایک شبہ سا تھا جس نے ایسے ان جانے اندھیرے گوشے سے سر اٹھایا تھا جہاں ہر وقت اندھیرا، سیلن اور پھپھوند رہتی تھی، پھر اس نے وہاں جڑ پکڑلی تھی اور اب دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا، راستے میں آنے والی چیزوں کو چپکے چپکے نگلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، یہ بے آواز کیفیت اس کے رینگنے کی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ چھت کی کڑیوں، دیوار کے اندرونی حصوں، درزوں اور ریخوں میں کوئی چیز چل رہی ہے، بہت سی ٹانگوں والی اور بے آواز، اس کے منہ کا لعاب تیزاب کی طرح کی طرح ہر چیز کو کاٹتا، نرم گودے کے ڈھیر میں تبدیل کرتا جا رہا ہے۔ اس مکان کو اندر ہی اندر کچھ کھائے جا رہا ہے۔ تب مجھے معلوم ہو گیا کہ اس چیز کا نام کیا ہے۔ یہ دیمک تھی۔

دیکھنے میں وہ دوسرے مکانوں جیسا تھا، نئے رنگ روغن کے بعد چمکتا ہوا اور دھوپ سے بھرا ہوا، کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ اندر ہی اندر وہ غارت ہو چکا ہے۔ آنے سے پہلے ہم نے اس پر سفیدی کروائی تھی، اور حالاں کہ یہاں آنے کے خیال سے کوئی بھی خوش نہیں تھا پھر بھی سب نے مل کر فرنیچر کو ترتیب سے رکھا تھا۔ یہ فیصلہ تو ہم نے پہلے ہی سے کر لیا تھا کہ کون کس کمرے میں رہے گا، سونے والے کمرے کون سے ہوں گے اور مہمانوں سے ملنے والے کون سے۔ جو کمرے سونے کے لیے طے کر لیے گئے تھے سب سے پہلے ان میں مسہریاں بچھائی گئیں تھیں اور بندھے ہوئے سامان سے چادریں تکیے رضائیاں نکال کر بچھونے بچھا دیئے گئے تھے تاکہ تھک ہار کر رات کو سونے لیٹیں تو نیند آ جائے۔ (مجھے اس کے باوجود رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس مکان کا سناٹا نامانوس تھا اور رات میں آنے والی مدھم صدائیں اجنبی۔ کچھ راتوں کے بعد مجھے مسلسل یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رات بھر، برابر کے کمرے میں کہیں کسی جگہ ہزاروں جبڑے چل رہے ہیں، مستقل حرکت میں ہیں۔) اگلے دن فرش پر قالین بچھ گیا، صوفے اپنی اپنی جگہوں پر جم گئے اور پردے ٹانگ دیے گئے تو گھر کی سی شکل بن گئی۔ خالی مکان میں بسا ہوا وہ دبا دبا سونا پن رخصت ہو گیا، اور رستا بستا گھریلو پن اس کی جگہ لینے لگا۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کہ سر چھپانے کا یہ جو آسرا ہو گیا ہے اس پر صبر شکر کریں اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھ کر بیٹھ رہیں۔ اور جیسے جیسے ہم وہاں رہنے لگے تو وہ ابتدائی مایوسی، بدحالی اور یہ احساس کہ ہم اپنے درجے سے نیچے گر گئے ہیں، یہ سب بھی کسی قدر مندمل ہونے لگے۔ میں نے ان میں سے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اس مکان کو دیکھ کر میرا پہلا تاثر کیا ہوا تھا۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے ضرور اس مکان میں جس کی وجہ سے یہاں آگے چل کر خرابی پیدا ہو گی۔ اس وقت سامنے کی دیوار پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صبح کے وقت وہ مکان آرام دہ اور پرسکون محسوس ہو رہا تھا۔ معاً مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ طمانیت

www.taemeernews.com

محض ایک دھوکا ہے، اس کی اصلیت ایسی نہیں ہو سکتی۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی، اس لیے میں یہ بات کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اب یہ شک یقین میں بدلنے لگا تھا۔ تازہ سفیدی والی دیواریں، کھڑکیوں میں ٹنگے ہوا سے اڑتے ہوئے پردے، کھلے ہوئے دروازے، کمرے میں ترتیب سے رکھا ہوا سامان، ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ یہ سب اوپری ہے۔ اندر ہی اندر شدید اعصاب شکن تناؤ اور دشمنی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھے ہوئے ہیں اور ذرا سا موقع ملتے ہی پھن کاڑھ لیں گے۔ مجھے دیواروں سے ان سانپ جیسے جذبوں کا سرسرانے کی آوازیں آتی تھیں۔ ان کا رینگنا محسوس ہوتا تھا۔

اس احساس میں بھی میں نے کسی کو شریک نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باقی گھر والوں کی اور زیادہ دل شکنی ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی یہاں اپنی خوشی سے نہیں آیا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہم نئے گھر میں آئے تو تھے لیکن بہت کچھ پیچھے چھوڑ دینے کے دکھ کے ساتھ۔ میں تو اس بات کو سمجھتا تھا کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہم اس پچھلے مکان میں خوش و خرم رہے ہیں، لیکن آخر کو وہ سرکاری مکان ہے اور ملازمت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد ہم اس میں نہیں رہ سکتے۔ اتنے برس سے اس میں رہنے کی وجہ سے ہمارا اس پر کوئی حق نہیں بنتا تھا۔ لیکن بیوی اور بچوں کو یہ بات قبول کرنے میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی کہ جس مکان میں ہم اتنے برسوں سے رہتے آئے ہیں، جہاں ہماری زندگی بڑے سکون اور سبھاؤ سے چلتی رہی ہے، وہ ہمیں اب چھوڑ دینا ہوگا۔ اس بات میں جبری فیصلے کی سی قطعیت تھی۔ وہ بار بار یہ سوال پوچھتے تھے کہ یہ تو ہمارا گھر ہے، ہم اسے کیوں چھوڑ دیں، دوسروں کے حوالے کر دیں۔ آخر کیوں؟

شاید وہ اس بات سے خوف زدہ تھے..... اس بات کو پوری طرح جانے بغیر..... کہ یہاں ان کی زندگی کا جو انداز تھا اور جو اچھا وقت بیتا تھا وہ ختم ہو جائے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گا۔ میں بھی اس لمحے سے بہت ڈرتا ہوں جب وقت ماضی بننے لگتا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ہماری بے خبری میں وہ وقت بیت چکا ہے۔ اور وہ زندگی ختم ہو چکی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہم تھوڑا سا مر چکے ہیں۔ جس وقت تک پورے کے پورے مر نہیں جاتے سامنے مستقبل ہے اور مستقبل کا مطلب ہوتا ہے بے یقینی۔

ہم لوگ اس مکان میں اتنی مدت سے رہتے آئے تھے کہ گھر کا تصور اسی سے بندھ گیا تھا۔ کبھی رات گئے کہیں سے آ رہے ہوتے تو بندر روڈ سے گارڈن روڈ کی طرف مڑتے ہی یہ احساس ہونے لگتا کہ بس اب گھر آ رہا ہے، نزدیک آ گیا ہے گھر..... یہ پیلے فلیٹوں والی سرکاری ملازمین کی کالونی ہمارا گھر ہے۔ اس جگہ کی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، جن کے ہم اس طرح عادی ہو گئے تھے جیسے یہ ہماری زندگیوں کا حصہ ہوں۔ ہفتے بھر دفتروں میں سوٹڈ بوٹڈ مقطع بنے ہوئے صاحب لوگ چھٹی کے دن کرتے پاجامے پہن کر اور کپڑے کے تھیلے لے کر گوشت

www.taemeernews.com

ترکاری خریدنے نکلتے تھے تو انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ہم بے تکلفی سے اپنے آنگن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوپہر کی خاموشی میں قریبی، واقع گاندھی گارڈن سے کوئی تیز آواز والا پرندہ اچانک بولتا ہوا اڑجاتا۔ دوپہر کا سناٹا شام کے سایوں میں گھلنے لگتا تو چڑیا گھر میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی۔ ہم اس وقت کورکشاؤں اور ٹیکسیوں سے پہچان لیتے تھے۔ چڑیا گھر کے گھنے پیڑوں پر سینکڑوں پرندے رات بھر بسیرا کرنے کے لیے جمع ہونے لگتے۔ اور سڑک کے شور میں ان کا شور گھل مل جاتا۔ بعض صبحوں کو ایسا ہوتا تھا کہ کالونی نیند سے پوری طرح جاگی بھی نہ ہوتی اور سرکاری ملازم دفتروں کو روانہ نہیں ہوئے ہوتے کہ چڑیا گھر سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آتی۔ مکانوں کا گھمبیر اور پرسکون سناٹا اس آواز سے شیشے کی طرح ٹوٹ جاتا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ شیروں کے پنجرے کی سلاخیں لوہے کی ہیں۔ بلکہ ہم اس گرج پر تھوڑا سا فخر محسوس کرتے تھے۔ شہر میں اور کس جگہ یہ ممکن تھا کہ اپنے گھر بیٹھ کر شیر کو دھاڑتے ہوئے سن سکیں؟ ایک دفعہ رکھوالے کی غلطی سے پنجرے کا تالا ٹوٹ گیا تھا، مگر شیر پھر بھی پنجرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔

اس علاقے کے جتنے چہرے تھے وہ ہمارے لیے مانوس تھے ہم یہاں اتنے عرصے سے رہ رہے تھے کہ وہ سب ہمارے لیے ایک بڑے سے کنبے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ شام کو دفتر سے آنے کے بعد نہا دھو کر، اجلے سفید کپڑے پہننے اور چائے پینے کے بعد میں برابر کے کسی گھر میں چلا جاتا اور تنخواہوں کے گریڈ، گریجوئٹی، انکریمنٹ، چھٹیوں اور دوسری مراعات کے بارے میں باتیں اور ہلکی پھلکی خوش گپیاں کرتا۔ میری بیوی رئیسہ کسی پڑوسن کے ساتھ ہائی وے پر اسمگلڈ غیر ملکی سامان کی دکانوں میں جانے کا پروگرام بناتی، میری دونوں لڑکیاں وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھتیں اور ٹیلی وژن کے ڈراموں میں آنے والی لڑکیوں کے انداز میں قمیض سلواتی تھیں اور بیٹا فراز (جس کا نام میں نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا کیوں کہ اس کی پیدائش کے ہفتے پھر بعد میرا پروموشن ہوا تھا) اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ رات گئے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر تیز رفتار گاڑیوں، ہوائی جہاز کے نئے ماڈلوں اور تیز آہنگ گیتوں کی باتیں کرتا تھا۔ اس محلے سے اپنے آپ کو اکھاڑنا ہمارے لیے بڑا مشکل تھا۔ اکھاڑنا تو مشکل تھا ہی، دوسری جگہ اپنے آپ کو جمانا اس سے بھی مشکل کام تھا۔ جب میں رئیسہ اور تینوں بچوں کو وہ مکان دکھانے لے گیا جہاں ہمیں منتقل ہونا تھا تو ان کے چہرے اتر گئے۔ دونوں لڑکیوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ فراز میری طرف دیکھ کر ناراض ہونے لگا۔ "اب ہم یہاں رہیں گے؟ اس ڈربے میں؟"

اس ڈربے میں رہنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور مترادف بھی نہیں تھا۔ بڑے مکان سے چھوٹے مکان میں منتقل ہونا ہی تو ایک تکلیف کا سبب نہیں تھا۔ میرے سامنے اس سے

www.taemeernews.com

بھی زیادہ بھیانک مسائل تھے۔ کبھی ان کا خیال آجاتا تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتا کہ کیسے ہوگا۔ ان سے کیوں کر نبٹوں گا۔ تنخواہ کے بعد معمولی سی، برائے نام پنشن میں گزارا کیسے ہوگا، گھر کی دال روٹی کیسے چلے گی؟ بیوی بچے زندگی کی جن سہولتوں کے عادی ہوگئے ہیں۔ قدم قدم پر ان کی محرومی کا احساس کچوکے لگائے گا۔ دفتر سے مجھے گاڑی اور ڈرائیور ملے ہوئے تھے، وہ واپس ہوگئے۔ فراز کو پہلے ہی دن کالج جانے کے لیے بس میں لٹکنا پڑا اور واپسی میں خالی بس کے انتظار میں دھوپ میں کھڑے رہنے سے منہ تمتما گیا۔ اس کی شکایت پر میں نے کوئی جواب نہیں دیا، مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میرے بچے جس طرز زندگی کے عادی ہوگئے ہیں، میں اب انہیں وہ فراہم نہیں کر سکوں گا۔ اس احساس نے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا اور یہ خلش گھن کی طرح مجھے کھانے لگی۔

ابتداء میں میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وقت کیسے کٹے۔ پہاڑ سا دن سر پر کھڑا تھا۔ صبح کی دھوپ دیواروں پر پھیلنے لگی تو ایک عجیب سی بے چینی نے مجھے آلیا۔ مجھے ایسے لگا کہ میں یہاں فالتو اور بے کار ہوں، اور اگر ان دیواروں سے باہر نہیں نکلا تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں نے سوچا کہ ذرا چہل قدمی کر کے دیکھوں۔ مکان سے تھوڑی دور ہی گیا ہوں گا کہ مجھے نور دین نظر آیا۔ اسے میں نے ہی اپنے دفتر میں چپراسی رکھوایا تھا۔ وہ میرے سامنے آرہا تھا مگر اس کے چہرے پر اتنی اجنبیت اور لاتعلقی کیوں تھی؟ اور وہ بھی زبردستی طاری کی ہوئی لاتعلقی؟ مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ یہ میرے سامنے آرہا ہے اور اس نے مجھے سلام نہیں کیا۔ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا، میں نے دل میں سوچا (کاش اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہو، میں اس کی نظروں سے چھپنے کی خواہش کرنے لگا کہ یوں کہ میرا بھرم رہ جائے اور میری انا کو ٹھیس نہ لگے)۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں میری طرف تھیں۔ لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے آر پار دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں وہاں نہیں ہوں، میری جگہ خلا ہے اور وہ اس خلا سے آگے دیکھ رہا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں چلتے پھرتے انسان کے بجائے خلاؤں کا تاریک اندھا گڑھا بنتا جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ یا تو بیمار ہے یا نشہ کرنے لگا ہے، دفتر جا کر اس کی مزاج پرسی کروں گا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں اب کبھی دفتر نہیں جاؤں گا، اور فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ نور دین کو میں کیوں دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی تھی۔ پھر کیوں اس نے مجھے پہچاننے اور سلام کرنے سے انکار کر دیا تھا؟ محض اس لیے کہ میں اب اس کے دفتر کا صاحب نہیں رہا تھا؟ میں افسری سے دست بردار ہوا تھا انسانیت سے تو نہیں۔ لیکن اگر اس نے مجھے سلام نہیں کیا تو میری عزت میں کون سے بٹہ لگ گیا، اپنی آرزدگی پر میں خود ہی ناراض ہونے لگا۔ لیکن میں اس احساس کو اپنے دل سے نکال نہیں سکا، اور ذلت کے اسی احساس کے ساتھ میں چہل قدمی کیے بغیر گھر واپس آگیا۔

www.taemeernews.com

بوجھل قدموں سے مجھے گھر آتا ہوا دیکھ کر رئیسہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ بیگم ذرا ایک پیالی چائے تو بنا دو۔

چائے کا نام سن کر وہ ناراض ہونے لگی۔ "یہ دفتر نہیں ہے جہاں دن بھر بیٹھے چائے پیتے رہو۔ یہ گھر ہے۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ یہاں اب کیا ہوگا؟ دو جوان بیٹیاں بیاہنی ہیں، کچھ ان کی بھی فکر ہے؟ ریٹائرڈ سرکاری افسر کی لڑکی کا رشتہ مانگنے کون آئے گا؟"

میں دم بخود رہ گیا جیسے اس نے جلتا ہوا بھوبل میرے چہرے پر مل دیا ہو۔ مگر وہ اس نظر نہ آنے والے زخم پر اور چنگاریاں بھری راکھ انڈیلتی رہی۔ "ہاتھ جھلاتے ہوئے چلے آئے نوکری سے۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے۔ ایک وہ بھی تو ہیں جنہوں نے سرکاری ملازمت میں بڑی بڑی کوٹھیاں کھڑی کر لیں، دروازوں پر تین تین گاڑیاں ہاتھیوں کی طرح جھول رہی ہیں۔"

"بس بس، رہنے دو۔ مجھے بھی خبر ہے کہ انہوں نے یہ کیسے کیا ہے۔ میں اتنے برس سرکاری نوکری کر کے باعزت ریٹائر ہوا ہوں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے ایمان بیچ کر کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

"تو چاٹو اپنے ایمان اور عزت کو دھر کے....." رئیسہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے اب روٹی بھی خود ہی پکانی پڑتی تھی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے سامنے تینوں بچے حیران پریشان کھڑے تھے۔ وہ گھر میں تیز آوازیں سننے کے عادی نہیں تھے۔

بڑی بیٹی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور گود میں سر رکھ دیا۔ "اس بات کا افسوس نہیں ہے کہ ہمارے پاس کیا کیا تھا جو چھن گیا، لیکن ابو کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر ہمارے پاس پیسے نہیں تو ہم سچ مچ کے غریب گھر میں پیدا ہوئے ہوتے؟"

فراز وہاں سے اٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور دانت پیس کر اس طرح کہا جیسے مجھے گالی دے رہا ہو۔ "مڈل کلاس۔" اور وہ باہر چلا گیا۔

اس نے کئی دن تک اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا۔ جیسے وہ دور بیٹھ کر ہماری قوت برداشت کا اندازہ لگا رہی ہو، دشمن کی طرح گھات لگائے بیٹھی ہو اور دور دور سے ہماری ہمت اور مدافعت کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنا چاہ رہی ہو۔ اور ہم کو اس کی موجودگی کے بارے میں بھی علم نہیں تھا۔ ہمیں تو اس وقت بھی خبر نہیں ہوئی جب وہ حملہ آور غنیم کی طرح ہماری صفوں کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ہمیں جب خبر ہوئی تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ورنہ ہمیں پتہ ہی نہ تھا کہ دیمک ہمیں اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر چکی ہے۔ دیمک سے ہونے والے نقصان کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ گھر میں دھول بہت بڑھ گئی تھی۔ جتنا بھی صاف کرو، ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی

www.taemeernews.com

رہتی تھی۔ گھر میں ہر وقت خاک اڑنا محض اتفاق نہیں تھا۔

مجھے مٹی بہت بری لگتی ہے۔ اور وہ دن مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں جب ہوا میں خاک اڑتی رہتی ہے۔ روشنی کے رخ سے دیکھو تو ہوا میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ذرے تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر مٹی کی تہہ ہر جگہ جم جاتی ہے۔ جس چیز کو ہاتھ لگاؤ، ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ اتنی خاک دھول سے میرا سانس گھٹنے لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے پھیپھڑوں پر بھی ریت کی تہہ جم جائے گی، اور وہ سانس کے ساتھ پھیل بھی نہ سکیں گے۔ میں ہاتھ میں چھوٹا سا رومال رکھتا ہوں اور گھر کے سامان کو جھاڑتا پونچھتا رہتا ہوں تاکہ مٹی نہ اڑے، سانس کے ساتھ نہ جائے۔ لیکن یہ عجیب مٹی تھی کہ صاف ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں بار بار رگڑتا تھا، بار بار جھاڑتا تھا اور پھر بھی ہر چیز گرد آلود، خاک کے پردے میں چھپی ہوئی ہوتی۔ میں نے دیوار پر انگلی پھیر کر دیکھا۔ اس مٹی کے ذرے موٹے سے تھے۔ ان کو دیکھ کر بھی میں کچھ نہیں سمجھا تھا۔

سمجھ میں تو اس وقت آیا تھا جب میں نے بھورے رنگ کی لکیر دیکھی تھی۔ کیکر کی ٹہنی جیسی پتلی لکیر جو الماری کے اوپر والے حصے کی طرف چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہاں ہم نے بہت سی ایسی پرانی چیزیں ڈال رکھی تھیں جن کا کوئی مصرف نہیں تھا (یا اگر پہلے کبھی تھا تو وہ عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا اور بھلایا جا چکا تھا) مگر جو پھینکی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ (پرانے چیزوں سے ہمارے کیسے جذباتی رشتے ہوتے ہیں!)۔ ان میں پرانی تصویریں بھی شامل تھیں۔ ٹوٹے پھوٹے اور مکڑی کے جالوں سے لپٹے ہوئے فریموں میں لگی ہوئی یہ تصویریں، جس کے شیشے شکستہ ہو گئے تھے اور کاغذوں کی رنگت بھوسلا ہو گئی تھی، کسی اور وقت کی مٹی سے میلی ہو رہی تھیں۔ ان میں جو گروپ فوٹوز تھے ان میں الگ الگ چہروں کو پہچان کر نام دینا اب ممکن نہیں تھا۔ میری طالب علمی کے زمانے میں کالج یونین کے عہدے داروں کے ساتھ تصویر (بہت پہلے کسی زمانے میں اس بات پر ہی فخر ہوتا تھا کہ میں ان کے ساتھ تصویر کھنچوانے میں کامیاب ہو سکا)۔ گریجویشن ڈے کی تصویر، ان دفتروں کے ساتھی ملازمین کے ساتھ تصویریں جن کی ملازمت میں مدتوں پہلے چھوڑ چکا اور وہ تقریبات جن کے خاص موقعے بھی ذہن سے محو ہو گئے۔ ان تصویروں میں دیمک لگ گئی تھی۔ بعض تصویریں تو دیمک پوری کی پوری چاٹ چکی تھی، بعض میں چند ایک چہرے کو دیمک کی زد میں آئے تھے اور ایک آدھ تصویر تو ایسی تھی کہ دیمک صرف فریم تک پہنچی تھی۔ میں نے دیمک کی سخت مٹی کو چٹکی سے مسل دیا۔ مٹی جھاڑی اور تصویروں کو واپس مچان پر ڈال دیا۔ پھر میں دیمک کے بارے میں بھول گیا۔

اس وقت شاید میں یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ صرف چند پرانی تصویروں کی بات ہے۔ اصل میں پاکستان کوارٹرز کی سرکاری رہائش سے عزیز آباد کے معمولی سے مکان میں آ بسنے کے اپنے مسائل ہی اتنے زیادہ تھے کہ دیمک کو کون یاد رکھتا۔ میں دیمک کو بھول گیا اور وہ اندر ہی اندر چیزوں کو

www.taemeernews.com

کھاتی رہی۔ مجھے پتہ ہی اس وقت چلا جب دیمک حد سے بڑھ چکی تھی، اس گھر میں اپنی بنیادوں کو مضبوط کر چکی تھی۔ کئی دنوں کے بعد میں نے کیکر کی ٹہنی سی وہ لکیر پھر دیکھی۔ اب کی بار اس کا رخ کتابوں کی شیلف کی طرف تھا۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو غلطی میری بھی تھی۔ اب میں روز تو کتابوں کو الٹا پلٹتا نہیں۔ نہ میں نے ان کو کبھی دھوپ میں رکھا۔ ایک زمانے میں تو بڑا شوق تھا۔ اب دن بھر دفتر میں مغز کھپانے کے بعد اتنا وقت ہی کہاں ملتا ہے کہ کوئی کتاب لے کر بیٹھوں۔ اس دن میں نے کتابوں کو زور زور سے جھاڑا۔ کئی کتابوں کو دیمک بالکل چٹ کر گئی تھی۔ کرشن چندر کی مرتب کردہ نئے زاویئے، (جلد دوم) جو مجھے کالج کی بزم ادب سے بیت بازی میں انعام کے طور پر ملی تھی، ہاتھ لگاتے ہی مٹی کا ڈھیر بن گئی۔ جسٹس امیر علی کی "اسپرٹ آف اسلام" کی صرف اوپری جلد اور نام کا سنہری ٹھپا رہ گیا، کلائیو بیل کی "سویلائزیشن" (جس کا ہلکے آبی رنگ کے سرورق والا پینگوئن ایڈیشن برسوں میرے زیر مطالعہ رہا ہے) دونوں کو دیمک نے کھا کر ختم کر دیا۔

اب میں ان کتابوں کو کیا کرتا؟ کتاب چاہے دیمک زدہ ہی کیوں نہ ہو، اسے پھینکا تو نہیں جا سکتا۔ غصے اور بے بسی کے عالم میں میں نے ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور دیاسلائی دکھا دی۔ کتاب جل کر راکھ ہو گئی اور دیمک کی مٹی کے کچھ ٹکڑے باقی رہ گئے، کیونکہ ان میں آگ مشکل سے لگتی ہے۔

کتابوں کو آگ لگا دینے کے بعد میں ایک بار پھر مطمئین ہو گیا کہ بات ختم ہو گئی ہے، مگر مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ محض شروعات تھیں، اور دیمک کا لشکر ایسے چھوٹے چھوٹے شب خون مارنے کے بعد بھرپور حملہ کیا چاہتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہو جانے سے بھی کیا فرق پڑا؟ میں کون سی روک تھام کر لیتا۔ ہوتا تو کچھ نہیں، شاید اپنے آپ کو تسلی دے لیتا۔ لیکن مجھے پتہ ہی چلا جب غنیم مجھے اندر سے کھوکھلا کر چکا تھا۔

مکان دیمک سے بھرا ہوا تھا۔ جلد ہی دروازے پر بھوری بھوری لکیریں ابھر آئیں، جو دروازوں کی چکنی، روغن کی ہوئی لکڑی پر ایسے پھیلنے لگیں جیسے صحت مند بدن پر کوڑھ۔ کھڑکیوں کے پٹ اتنے پھول گئے کہ نہ پوری طرح بند ہوتے نہ کھلتے تھے، چوکھٹیں ایسی ہو گئیں کہ کسی کا ہاتھ لگ جائے تو ڈھے پڑتی تھیں۔ جگہ جگہ سے اکھڑنے لگی تھیں۔ اور دروازے ان میں ایسے جھول گئے جیسے فالج زدہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں۔ چھت کا پنکھا بھی چلاؤ تو اس میں سے دیمک جھڑتی تھی۔ صوفے کے ہتھے میں دیمک لگ گئی اور پھر اس نے جگہ جگہ سے صوفے کا کپڑا بھی چھید ڈالا۔ کرسیوں کے پائے گر گئے اور وہ لنگڑی ہو گئیں۔ پردوں کے پیلمٹ کو دیمک نے اس طرح سے کھایا کہ وہ بیچ میں سے ٹوٹ گیا۔ پردے کی پوری لمبائی میں جابجا دیمک نے گھر بنا

www.taemeernews.com

لیے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دیمک کو ایک جگہ ڈھونڈنے کے بعد اس کا قلع قمع کرنے کی ترکیب سوچتے، وہ دوسری جگہ پر ظاہر ہو جاتی۔ وہ کسی اندیکھی فوج کی طرح گھر کو برباد کیے دے رہی تھی۔ میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دیمک کو اپنا گھر غارت کرتے ہوئے دیکھتا، اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ میں بس یہی کر سکتا تھا کہ دیمک کے گھروں کو جہاں دیکھتا اس کی بھربھری ریت کو اکھاڑنے لگتا، دیمک کی تعمیر کو توڑنے لگتا۔ سفید لجلجے سے پردار کیڑے اپنے گھر کی چھت سے محروم ہو جانے کے بعد جلدی جلدی بھاگتے ہوئے نظر آتے۔ میں انہیں جوتے سے دبا کر پیس ڈالتا، مگر کیا فائدہ، کہاں تک؟ میں ایسے دشمن کا بھلا کیا مقابلہ کرتا جو میرے ہتھیار اٹھانے سے پہلے ہی مجھے پسپا کر چکا تھا۔

دیمک سے کوئی چیز نہیں بچتی تھی۔ اور کسی چیز کو بچانے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ آناً فاناً وار کرتی تھی، اور دیکھتے دیکھتے تہس نہس کر ڈالتی تھی۔ ایک دن الماری کے پٹ پر ذرا سا خاکستری دھبہ نظر آتا اور اگلے دن الماری میں ٹنگے ہوئے کپڑوں میں چھید اور بغارے نظر آنے لگتے۔ ایک آدھ دن اور رک جاؤ تو کپڑوں کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

دیمک کے خلاف میری آخری کوشش وہ تھی جب میں نے پیسٹ کنٹرول والوں کو بلوایا تھا۔ اول تو ان کو بلوانے کے لیے ہی مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ رئیسہ اور بچے مان کے ہی نہیں دیتے تھے کہ انہیں بلوانا چاہیے۔

"اس کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟" وہ بحث کر رہے تھے۔

"کمال ہے! کیا تم لوگ دیکھ نہیں رہے کہ دیمک گھر کو کھنڈر بنائے دے رہی ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"اس کام میں بے کار اتنے سارے پیسے خرچ ہوں گے" وہ کہتے تھے۔ "ہم تو اپنی ایک ایک خواہش پر دل مار کر رہ جاتے ہیں اور آپ اس فضول، غیر ضروری کام میں اتنا خرچہ کر رہے ہیں۔"

"مجھے نئے کپڑے چاہیے تھے اور آپ نے منع کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ پیسے نہیں ہیں۔ مجھے نئے جوتے، مجھے نئی قمیض، مجھے یہ، مجھے وہ ..... اور ان کے بجائے آپ اس میں اتنے پیسے ضائع کر رہے ہیں؟"

چند دن بحث کرنے کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ ضرورت کا احساس میں کیسے دلاتا ان کو؟ کیا انہیں خود نظر نہیں آ رہا تھا؟ اب اور کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ گھر کو تباہی سے بچانے کے لیے کسی نہ کسی کو تو کچھ کرنا ہی تھا، اور اس خطرے کا احساس صرف مجھی کو تھا، اس لیے احتیاطی تدبیر

www.taemeernews.com

اختیار کرنے کی ذمہ داری بھی میرے کاندھوں پر ہی آن پڑی تھی۔ مجھے کوئی نہ کوئی عملی قدم اٹھانا تھا۔ مخالفت کی پرواہ کیے بغیر۔ ایک دن کسی کو بتائے بغیر، میں نے جاکر پیسٹ کنٹرول کے دفتر میں اپنے گھر کا پتہ لکھوا دیا۔ اور ان سے زبانی درخواست بھی کی کہ میرے گھر کو ڈس انفیکٹ کر دیں۔ گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے رکھے ہوئے تھے، وہ میں نے وہاں ایڈوانس کے طور پر جمع کرا دیے۔

وہ لوگ سرخ رنگ کی بڑی سی گاڑی میں آئے تھے، جس میں آگے دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور پیچھے سارا سامان رکھا ہوا تھا۔ ان کے پاس اسپرے کرنے کی مشینیں بھی تھیں، جن کا رنگ بھی سرخ تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ کمروں سے باہر نکل آئیں اور کھانے پینے کی چیزوں کو ہٹا لیں۔ انہوں نے سارے کھڑکی دروازے بند کر دیئے۔ انہوں نے چہروں پر ماسک چڑھا لیے اور اسپرے کرنے لگے۔ (اس غبار سے بچنے کے لیے میں نے پہلے ہی سے منہ پر کپڑا باندھ لیا تھا، مگر رئیسہ کو بہت کھانسی اٹھی اور رات کو پیٹ میں درد ہوا اور اسے اٹھ کر درد کی گولی کھانا پڑی)۔ اسپرے کرنے کے بعد انہوں نے پھاٹک کے پاس بنی ہوئے کیاری میں ایک گول گڑھا کھودنا شروع کر دیا اور اس میں دوا ڈالنے لگے تاکہ دیمک مکان کی بنیادوں تک نہ پہنچ جائے۔

ان کی سرخ رنگ کی کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑی ابھی گلی سے مڑی ہی ہوگی، میں پھاٹک بند کر کے اندر جانے ہی والا تھا کہ میری نظر اس پر پڑی۔ میں نے دیکھا..... وہی مٹی کا نشان اور اس سے پھوٹتی ہوئی کیکر کی ٹہنی جیسی لکیر..... دیمک!

اس کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ ابھی، اتنی جلدی، دیمک آن پہنچی؟ اور جو میں نے اتنا خرچ کیا تھا، وہ سب بے کار گیا؟ کیا ہم کبھی دیمک سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے؟ کیا دیمک ہماری چیزوں کو کھاتے کھاتے ہمیں بھی نگل جائے گی؟

میں نے رئیسہ کو آواز دی اور سامنے والے دروازے کے اس حصے کی طرف اشارہ کیا جس پر مجھے دیمک کا نشان نظر آیا تھا۔

"وہ دیکھو، دیمک لوٹ آئی ہے!" میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

رئیسہ کچھ نہیں بولی۔ اس نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا پھر میری طرف۔ "دیمک؟" اس کے لہجے میں برہمی تھی اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیمک والے دروازے کو اسی طرح دیکھا جیسے نور دین نے مجھے دیکھا تھا، جیسے وہ دیکھ رہی ہو اور اسے وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا ہو۔ اس نے مجھے دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر اندر چلی گئی۔

میں پھاٹک کھول کر چلا آیا اور میری سمجھ میں یہی آیا کہ سب کو بتا دوں کہ دیمک لگ

www.taemeernews.com

رہی ہے، ہر چیز میں دیمک لگ رہی ہے، کھڑکیوں دروازوں میں دیمک، چھتوں اور دیواروں میں دیمک، مکانوں کی بنیادوں میں دیمک، کرسی میز اور پلنگ کے پایوں میں دیمک، صوفے پردے اور قالین میں دیمک، کپڑوں میں دیمک، کتابوں میں دیمک..... اس درخت کو ہاتھ نہ لگانا، اس کا تنا دیمک سے کھوکھلا ہو چکا ہے، چھوتے ہی گر پڑے گا اور تم ملبے میں دب جاؤ گے۔ خبردار کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا، یہاں دیمک ہے۔ زمین کو دیمک لگ رہی ہے، آسمان کو دیمک لگ رہی ہے، پیڑ پودوں اور جانوروں کو دیمک لگ رہی ہے..... ہر جگہ چھا گئی ہے دیمک!

دیمک بہت مصروف ہے۔ مٹی کا یہ گھر تیزی سے دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے مستعد کیڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ہر جگہ ہیں۔ جہاں جاتے ہیں اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اس جگہ پہلے جو کچھ تھا اسے کھا لیتے ہیں اور اس کے بجائے ان کی اگلی ہوئی مٹی کی یہ نلکی نما تعمیر بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے لعاب نے اس مٹی کو بہت مضبوط کر دیا ہے، سرنگ کی طرح۔ اسے ناخن سے آسانی کے ساتھ کھرچا نہیں جا سکتا کہ اس کے قلعہ بندی نظر آسکے۔ ناخن کو اتنے زور سے دبانا پڑتا ہے کہ انگلی کی پوریں سفید ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر تک پتہ نہیں چلتا کہ ان کے گھر میں ایک روزن ہے جس سے ان کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ لیکن اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو یہ سفید کیڑے تتر بتر ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں، آپ انہیں چٹکی سے پکڑ کر مسل سکتے ہیں۔ پھر بھی اس خاکی سرنگ کا دوسرا حصہ آپ کی آنکھ سے اوجھل رہتا ہے۔ یہ سرا ان کے گھر کے مرکز تک جاتا ہے، جہاں دیمک سماج پل بڑھ رہا ہے۔ ایسی نہ جانے کتنی سرنگیں ہیں، کچھ آدھی کچھ پوری، کچھ بننے کے عمل میں، جو کارکن دیمک اور سپاہی دیمک سے بھری ہوئی ہیں۔ ان کے منہ دن رات چل رہے ہیں، یہ جو کچھ اپنے سامنے پاتے ہیں، اسے چبا کر غذا بنا لیتے ہیں اور اس سے اپنے پورے دیمک دل کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان کے ان تھک جبڑے مسلسل حرکت میں ہیں۔ جو کچھ انکے سامنے آتا ہے، لکڑی، کاغذ، کپڑا، چمڑا اسے نگل جاتے ہیں۔ تمام سرنگیں ایک جگہ پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں جہاں کھائی ہوئی لکڑی سے گنبد جیسی کوئی چیز بنا دی گئی ہے تاکہ شاہی جوڑا اس میں رہ سکے۔ یہ ساری جگہ ملکہ دیمک نے گھیر رکھی ہے۔ اس کے بے ہنگم اور بے تحاشہ پھیلے ہوئے جسم کے نیچے ہی کہیں بادشاہ دیمک چھپا ہوا پڑا ہے۔ ملکہ محض ایک بڑا سا پیٹ ہے جو انڈوں سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ پھٹ پڑنے کو ہے۔ وہ رکے بغیر ہزاروں کی تعداد میں انڈے (ننھے ننھے بند کی دانوں جیسے) خارج کیے جا رہی ہے، جنہیں کارکن کیڑے وصول کر لیتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے ہیں۔ سینکڑوں کارکن اس سے چمٹے ہوئے ہیں، اسے چاٹ رہے ہیں، رزق کی تلاش میں اسے چوس رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ اسے بھنبھوڑ کھائیں گے۔ کارکن اور سپاہی کیڑے اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو اپنے جبڑوں کے ذریعے برادے میں تبدل کرنے میں

www.taemeernews.com

مصروف ہوں گے کہ ایک دن ملکہ کی زرخیزی کو زوال آجائے گا۔ پہلے پہل کچھ نہیں ہوگا۔ پھر ان بے زبان کیڑوں میں دبی دبی مخاصمت سر اٹھانے لگے گی۔ دیمک گھر میں ایک نئی سازش پلنے لگے گی۔ اپنا جمع کیا ہوا سارا شہد پی کر چھتہ چھوڑنے کے بخار میں مبتلا مکھیوں کی طرح دیمک میں بے چینی پھیلنے لگے گی۔ ان کا زیرزمین سماج ایک بے چین بھنبھناہٹ سے بھر جائے گا، کیڑوں کی بھاگ دوڑ اور گھبراہٹ نقطۂ عروج کو پہنچ جائے گی۔ اور پھر اچانک کوئی خفیہ اشارہ، جس کے پاتے ہی دیمک نقل مکانی شروع کر دے گی۔ آنکھوں سے عاری اور جنس سے محروم کارکن ہزاروں کی تعداد امڈنے لگیں گے، دیمک کے کھائے ہوئے اس مکان کے کونے کھدروں سے باہر نکل آئیں گے، اپنے جفاکش اور بلانوش جبڑوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک مٹانے کے لیے بے تاب ہو کر آگے بڑھتے جائیں گے۔ مٹی کی یہ لکیر اور آگے سفر کرنے لگے گی۔ دیمک نے اب کسی نئے گھر کا رخ کیا ہے۔

۱۹۸۵

ooooo

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

کاگ داس

www.taemeernews.com

*

وہ اڑتا ہوا آیا اور گاڑی کی ونڈ اسکرین سے ٹکرا گیا۔ مجھے بس یہی نظر آیا کہ کوئی چیز بہت تیزی سے آئی اور شیشے سے ٹکرا کر دھپ سے گر گئی۔ میرے دونوں پاؤں بریک پر جم گئے۔ یہ کیا تھا، کسی نے پتھر مارا تھا؟ میں ان جانے میں چلتا ہوا کسی جلوس یا فساد کے درمیان تو نہیں پہنچ گیا، مجھے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ لیکن گاڑی کا شیشہ ٹوٹا نہیں تھا۔ میں نے گاڑی سے نیچے اتر کر دیکھا۔ وہ پتھر نہیں تھا، پرندہ تھا۔ شیشے سے ٹکرا کر ایک طرف کو گرے ہوئے اس گیند کو پہچاننا ممکن تھا کہ یہ پھولے ہوئے پروں والا کوّا ہے۔ اس کوّے کی چونچ کھلی ہوئی تھی اور پنجے ٹیڑھے ہو رہے تھے۔ یہ زندہ ہے یا مر چکا ہے، میں اس کے اوپر جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کا بدن سیاہ پروں سے ڈھکا ہوا تھا جن میں ایک روغنی چمک تھی، جس کی وجہ سے صبح کی دھوپ میں ان پر نیلگوں اور کاہی سائے دکھائی دے رہے تھے۔ سینے اور گردن کا سفید رنگ سر کی سیاہی میں مل جاتا تھا اور یہ سیاہی اس کا چونچ پر ختم ہوتی تھی۔ اس سیاہی میں اس کی آنکھیں بھی چھپی ہوئی تھیں، جن کو میں پہلے پہل الگ سے نہیں پہچان پایا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہاں سیاہ رنگ میں گہرائی ہے اور ایک چمک ہے۔ اس کی سیاہ آنکھ کے اوپر تنی ہوئی جھلی میں حرکت ہوئی، میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ پوٹے کے ملگجے، سفید سرمئی پروں کے نیچے جہاں کہیں اس کا دل ہوگا، کچھ گرمی تھی۔ مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پا کر اس کی آنکھ جھپکی۔ اس میں بھی حیرت تھی، اور گہرا استعجاب۔ اور حیرت کے ساتھ بے بسی۔ اس نے بڑی تکلیف کے ساتھ گول دیدہ گھمایا اور بے بسی پہلے مغائرت اور پھر خوف میں بدل گئی۔ اس نے اپنے پھیلے ہوئے پروں کو گھسیٹ کر دور جانا چاہا، اور سارے بدن کو یوں تان لیا جیسے اڑ جانا چاہتا ہو۔ اس نے پنکھ ہلائے لیکن وہ اڑ نہیں سکا۔ داہنی طرف کا پنکھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ وہ اسے حرکت دینا چاہتا تو پروں میں ایک خفیف سی جنبش ہوتی اور وہ پھر سے نیچے ڈھلک جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ اس کا کھلا ہوا پنکھ نہیں ہے، ٹوٹی ہوئی چھتری ہے، جو بارش میں بھیگ جانے کے بعد کسی نے دھوپ میں سوکھنے کو ڈال دی ہے۔ وہ اب سڑک کے بجائے فٹ پاتھ پر آ گیا تھا اور میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کے آگے دو دو قدم پھدک رہا تھا۔ لٹکے ہوئے پر کو گھسیٹتا ہوا، بے ڈھنگے پن سے چلتا ہوا وہ مجھ سے بچ رہا تھا۔ یہ ذرا دیر میں اڑ جائے گا، یوں بھی سیانا جانور ہے، اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، میں نے سوچا اور اپنے تئیں کوّے کی طرف سے مطمئن ہو کر اسے فٹ پاتھ کے پتھروں پر پھدکتا ہوا چھوڑ کر اپنے راستے پر چلا گیا۔

کوّے سے میری اگلی ملاقات شام کو ہوئی۔ اس بار بھی میری نظر اس پر بعد میں پڑی۔ پہلے مجھے بچّوں کا وہ کھیل دکھائی دیا تھا جس میں کوّا نشانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ دفتر سے گھر

www.taemeernews.com

آنے کے لیے گلی کا موڑ مڑتے ہی مجھے بچّوں کی بھیڑ نظر آئی۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان کوئی چیز تھی جسے وہ بہت انہماک سے دیکھ رہے تھے، اور بار بار خوشی سے چلا اٹھتے تھے۔ کھیل کے جوش و خروش میں انہوں نے گاڑی کے ہارن کی آواز بھی نہ سنی۔ میں نے کئی بار ہارن بجایا اور جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو مجھے گاڑی روک کر نیچے اترنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کھیل کی لگن اور خوشی سے دمک رہے ہیں۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ خوشی وہ تھی جو دوسرے جاندار کو ایذا پہنچا کر ہی حاصل ہوتی ہے۔ پر ٹوٹے ہوئے، لنگڑے کوّے کی تکلیف ان معصوم بچّوں کی خوشی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں میں دوہری بٹی ہوئی سفید ڈور باندھ دی گئی تھی، جس کا سرا ایک بچّے کے ہاتھ میں تھا۔ بچّہ ڈور کو ٹھمکا دیتا تو کوّا زمین پر پھسلتا ہوا چلا جاتا۔ کوّا اپنا سر نیہوڑا کر حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا کہ اس کے پنجوں تلے زمین کیوں نکلی جا رہی ہے، اور خوف سے کائیں کائیں کرتا تو بچّے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ وہ پریشان ہو کر اپنے پر پھڑپھڑاتا، اڑنے کی کوشش کرتا، اور پنجوں میں بندھی ڈور سے الجھ کر گر پڑتا تو وہ حد سے زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا، مضحکہ خیز اور قابلِ نفرت، اور بچّے سڑک سے کنکر چن کر اس کا نشانہ لگاتے۔ کوّا ان کے کنکروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر پھدکنے کی کوشش کرتا اور اس کی کائیں کائیں کی آواز گھٹی گھٹی سی معلوم ہوتی۔ اس آواز میں جیسے شکوہ تھا۔ اور آنکھوں میں دکھ۔ میں نے بچّوں کو ڈانٹا اور جب وہ کوّے کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے، تو آگے بڑھ کر سب سے بڑے بچّے کے ہاتھوں سے اسے جھپٹ لیا۔ کوّا اس قدر نڈھال ہو چکا تھا کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، اس نے اپنے پنجے پیٹ کی طرف سکیڑ لیے اور میری ہتھیلی میں سمٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے تو مجھے کیا پہچاننا ہوگا لیکن میں جان گیا تھا کہ یہ وہی صبح والا کوّا ہے۔ اس کے چمکیلے روغنی پروں پر مٹی لگی ہوئی تھی اور پنجے ڈور میں بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ میں شاید تھوڑی دیر بعد اس کوّے کو وہیں چھوڑ دیتا، لیکن بچّوں کی ٹولی جوش میں آئے ہوئے سفید فام ہجوم کی طرح بپھر گئی تھی جو کسی حبشی کا سر اتارنے کے لیے جمع ہوا ہو اور عین وقت پر کوئی اس زخمی کالے کو ان سے چھین لے۔ وہ میرے ڈانٹنے پر بھاگے نہیں، بلکہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے پھینکے ہوئے کنکر اور مٹی کے ڈھیلے مجھے کوّے کو ان کے حوالے کر دینے پر مجبور نہ کر سکے۔ میں کوّے کو گھر لے آیا۔

"کوّا بھی کوئی گھر میں رکھنے کا پرندہ ہے"۔ میری بیوی نے مجھے گھر میں کوّا لاتے ہوئے دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کیا۔ "اس کی آنکھ میں آدمی کی مروت نہیں ہے، یہ پالتو ہو کر نہیں رہتا۔ یہ نحوست کی نشانی ہے"۔ اس نے مجھے سمجھانا چاہا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ "تم نے بھلا آج تک کسی گھر میں کوّا پلا ہوا دیکھا ہے؟" اس نے یک طرفہ بحث میں آخری دلیل

www.taemeernews.com

پیش کی جو اس کے خیال میں مجھے لاجواب کر دینے کے کافی تھی۔ میں چپ چاپ بیٹھا کوّے کا سر سہلاتا رہا۔ اس کی آنکھیں درد اور تکلیف سے بند ہوئی جاتی تھیں، اور وہ کبوتر کی طرح گم متھن بیٹھا تھا۔ میں نے دھیرے سے اسے فرش پر رکھ دیا۔ میری گود سے اتر کر اس نے اپنے پنجے فرش پر ٹکا دیے، اور کسی نئے گھر میں آئے ہوئے اجنبی مہمان کی طرح چاروں طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ کمرے کے اندر مرہم کا ٹیوب رکھا ہے، جو گھر کے کسی بچے کے چوٹ لگ جائے تو اس پر رکھا جاتا ہے۔ میں مرہم لے آیا، روئی پر لگا کر اسے کا پھاہا بنا دیا اور اس پھاہے کو کوّے کے زخمی پنکھ پر رکھ دیا۔

مرہم پٹی کروا کے کوا وہیں گم سم سا بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی اس کی چونچ کھلتی او ایک ہلکی سی کاں کاں کی آواز برآمد ہوتی۔ شام ہوئی تو میں نے گندھے ہوئے آٹے کی چھوٹی چھوٹی مڑوڑیاں بنا کر ایک طشتری میں اس کے آگے رکھ دیں۔ میں نے اس کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازہ بھی بھیڑ دیا کہ کوا باہر نہ نکل جائے، اور کنڈی چڑھا کر سونے چلا گیا۔

اگلی صبح میری آنکھ اس کی کائیں کائیں سے کھلی۔ یہ آواز کل کے مقابلے میں بہت توانا تھی۔ اس میں زندگی تھی۔ میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے بچپن کے وہ دن یاد کیے جب میں ایک بہت چھوٹے سے شہر کے سرکاری اسپتال میں داخل تھا اور میری ہر صبح کوّے کی آواز سے شروع ہوتی تھی۔ ان دنوں میرے پیر کی ہڈی میں سے پیپ نکلتی تھی اور مجھے بڑا تیز بخار آتا تھا۔ ڈاکٹر بڑا موٹا سا انجکشن لگانے آتا تھا اور میں روتا تھا تو امی ابو میرے ہاتھ زور سے پکڑ لیتے تھے کہ میں انجکشن والے ڈاکٹر کو دھکیل نہ سکوں۔ اس وقت صرف کوّا میرا دوست تھا۔ اسپتال کے لان میں وہ دھوپ کے ساتھ ساتھ پھدکتا ہوا آتا، کبھی اڑ جاتا اور درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا۔ میں چائے میں توس بھگو کر ڈالتا تو وہ نیچے اتر آتا اور میری بیمار تنہائی تھوڑی دیر کے لیے بہل جاتی۔ میں نے اس دن بھی کوّے کے سامنے چائے میں بھیگے ہوئے توس کے ٹکڑے ڈال دیے۔ وہ ان ٹکڑوں کو اپنی چونچ سے چنتا ہوا میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھ سے مانوس ہو گیا تھا، کتے کی طرح، بچے کی طرح۔ میں دفتر سے آ کر بند کمرے کی کنڈی کھولتا اور اسے کھانا ڈالتا تو وہ مجھے دیکھتے ہی پھدکتا ہوا میرے پاس آ جاتا اور کائیں کائیں شور مچا دیتا۔ میں اس کو پکڑنا چاہتا تو وہ کائیں کائیں کرتا ہوا بھاگنے لگتا اور دو قدم تیز تیز چل کر پھر رک جاتا جیسے میرے ساتھ شرارت کر رہا ہو اور ہم دو خوش باش بچوں کی طرح کھیل رہے ہوں۔ میں کمرے کو بند کرتا اور تالا لگا کر دفتر چلا جاتا۔ میرے گھر والے مجھ سے خفا تھے کہ میں نے گھر میں نحوست پال رکھی ہے، اور کوّا میری اس خفیہ زندگی کا راز دار ہے، جس میں انہیں شریک نہیں کیا۔ انہوں نے گھر میں ہونے والے دو چار معمولی نقصانات کا ذمہ دار کوّے کی موجودگی کو ٹھہرایا۔ ان کی برہمی کے باوجود میں نے کوّے کو کئی دن وہاں رکھا۔ ایک شام میں

www.taemeernews.com

واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ فرش کے بجائے الماری کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر پہلے کی طرح میرے آگے آگے بھاگنے کے بجائے اس نے پر کھولے اور اڑ کر دوسری طرف جا بیٹھا۔ اب اس کی آزادی کا وقت آگیا ہے، اسے اڑتا دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ آزادی کے ساتھ اس گھر سے رخصت کا بھی، خوشی میں کچھ افسوس بھی شامل ہوگیا۔ میں نے دروازے کے پٹ وا کر دیئے اور کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ تھوڑی دیر تک کوّا وہیں بیٹھا رہا۔ اڑا بھی تو کمرے کے اندر ہی رہا۔ میں نے اسے ہنکانے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ اس کی آنکھوں میں پھر حیرت عود آئی اور ملال، کہ یہ آج روٹی کھلانے کے بجائے بھگا کیوں رہا ہے۔ وہ تیر کی طرح کھڑکی سے نکلا اور گھر کی دیوار پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ چاروں طرف حیرت اور بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر نیہوڑا کر ادھر ادھر دیکھا: کائیں کائیں کی اور پر مار کر لمبی اڑان بھری۔ اس کے کالے پر ایک لمحے کے لیے دھوپ میں چمکے، پھر وہ نیلے، دھوپ بھرے آسمان میں ایک سیاہ نقطہ بنتا گیا اور جلد ہی وہ نقطہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں کھڑکی سے کھڑا کوے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بچپن میں بھی مجھے بہت دکھ ہوتا کہ چڑیاں اور کوّے مجھے آتا دیکھ کر اڑ کیوں جاتے ہیں، میرے دوست کیوں نہیں بنتے۔

اس کیفیت نے کوّے کا روپ اختیار کر لیا۔ وہ سرنگ کے اندھیرے میں نمودار ہوا۔ اس سے پہلے وہ جگہ بالکل تاریک پڑی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا ہوا مدھم سانس لے رہا تھا، اتنے مدھم کہ میں ان کی آواز بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اندھیرے میں ہر شے ساکت تھی اور بالکل اکیلی، اور منتظر۔ وہ اس اندھیرے کے پردے کو چیر کر نکلا۔ اندھیرے میں موج سی اٹھی اور وہ پیٹ کے بل رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی، اور میری آنکھیں مسحور ہو کر بالکل بے دھیانی کے عالم میں اس سرسراہٹ کو تکنے لگیں، اس پر جم کر رہ گئیں.... خفیف حرکت، اس حرکت کرنے والے بدن کا دھندلا، ادھورا خاکہ، سمٹتا بڑھتا ہوا اس کا پھیلاؤ، ایک واضح، کٹاؤ دار شکل اختیار کرتا ہوا، اندھیرے سے الگ ہو کر ابھرتا ہوا.... کوّا۔ وہ کپکپاتا ہوا گوشت پوست اور لرزتے ہوئے بال و پر، ایک جھٹکے ساتھ قطعیت اور اعتماد حاصل کرتے ہوئے، پروں کی سیاہ میل خوری چمک، اندھیرے میں ارتکاز کے ساتھ گھورتی ہوئی آنکھ جو ایک لحظے کے لیے ٹھٹھکی، پھر وہ بولا اور اس آواز کے ساتھ میں نے بالآخر کوے کو دیکھا۔

"یہ تو پوری کوا گُہار ہے" دینو نے اپنے سر پر بچاؤ کے لیے پگڑی لپیٹے ہوئے کہا۔ اس کی جان عجیب مشکل میں تھی۔ ادھر اس نے گھر سے باہر قدم نکالا، اور کوّوں کو نہ جانے کیسے خبر ہوجاتی۔ کائیں کائیں کرتے ہوئے وہ درختوں، دیواروں اور بجلی کے کھمبوں سے اڑتے، اس کے

www.taemeernews.com

گرد منڈلانے لگتے اور اس کے گنجے سر پر ٹھونگیں مارتے۔ کوّوں کی چونچیں اس کے سر کو ادھیڑ ڈالتیں، کچّے کھرنڈ اکھڑ جاتے، ان سے خون رسنے لگتا۔ اس نے کوّوں کی ٹھونگوں کے ڈر سے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ گھر کی دیوار پر کوّا بولتا تو وہ سہم جاتا۔ اس کو پہلے ہی منع کیا تھا کہ کوّوں سے چھیڑ خانی مت کرنا۔ مگر وہ نہیں مانا تھا اور اس نے کوے کے گھونسلے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ بس تبھی سے کوّے اس کی جان کے لاگو ہو گئے تھے۔

گھر کا ایک دروازہ پیچھے کھلتا تھا۔ وہاں ایک کچّی گلی تھی جو کہیں بھی نہیں جاتی تھی، تھوڑی دور چل کر ختم ہو جاتی تھی۔ پڑوس والے اس میں کوڑا پھینکتے تھے، بسکٹ کے خالی ڈبے، روئی کے لمبوترے ٹکڑے، پلاسٹک کی تھیلیاں.... ابو نے وہاں نیم کا پیڑ بو دیا تھا۔ اب یہ بہت بڑا درخت تھا، اتنا بڑا کہ اس کے تنے کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو گھنی ٹہنیوں اور پتوں کی کوئی حد ہی نہیں نظر آتی تھی۔ شاخوں کے درمیان کہیں کہیں آسمان کٹی ہوئی پتنگ کی طرح پھنسا نظر آتا اور شاخوں کا سہارا لے کر دھوپ نیچے اترتی۔ اس کی ٹہنیوں پر بہت سارے کوّے بیٹھ کر کائیں کائیں کرتے اور ان کی آوازیں گھر کے شور میں رل مل جاتیں جیسے یہ بھی اس گھر کی آوازوں کا حصہ ہوں۔ شاید وہ اس پیڑ پر گھونسلا بنا رہے تھے۔ چڑیوں کا جھنڈ کہیں سے اڑتا ہوا آتا، کچھ دیوار پر بیٹھتیں، کچھ نیم پر۔ لیکن جیسے ہی کوئی کوّا ان کے بیچ میں بول اٹھتا، وہ پھر سے اڑ جاتیں۔ گھر کے دوسری طرف خالی جگہ میں پارک بن گیا تو نیم کا پیڑ اس کی حدود میں آ گیا۔ وہ ہمارا نہیں رہا لیکن اس کی چھاؤں ہمارے گھر میں آتی تھی، کوّے اس سے اڑ کر ہماری دیوار پر بولتے تھے اور سنسان دوپہروں میں ہم بچّے ننگے پاؤں اس کے نیچے کچّی پکّی نبولیاں بینتے تھے۔ اس وقت دینو بھی ہمارے ساتھ کھیلنے آ جاتا تھا۔ دینو کی ماں دال کی بڑیاں اور پاپڑ بیچنے آتی تھی۔ امی اس سے پاپڑ خرید کر تلتی تھیں تو پاپڑ پھیلتا جاتا اور کڑاہی میں سے چھن من کی آوازیں آتی تھیں۔ اس کا باپ گلاس برنی والا تھا جو گھر گھر جا کر پرانے کپڑوں اور جوتوں کے بدلے ڈونگے، رکابیاں، گلاس اور برنیاں دیتا تھا۔ دینو دن بھر ہمارے گھر میں کام کرتا اور رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا، جو گلیوں، کھمبوں اور میدانوں کے اس ٹکڑے سے آگے کہیں تھا جس سے میں مانوس تھا۔ "اس کا گھر دور ہے" اس کی ماں نے بتایا تھا۔ مجھے اس پر حیرت بھی ہوتی تھی اور رشک بھی آتا تھا۔ یہ دینو کا بھید تھا کہ وہ میری طرح نیکر کے بجائے پاجامہ پہنتا تھا، اس کی ماں بھی تھی اور باپ بھی، اس کے بہت سارے بہن بھائی تھے اور وہ اپنے گھر کے بجائے ہمارے گھر میں رہتا تھا۔

یہ دینو ہی تھا جس نے پہلی بار کوے کا گھونسلا تاڑا تھا۔ نیم کی اوپر والی شاخوں میں سے، جہاں دیکھنے سے آسمان، سبز شاخیں اور دھوپ گول گول گھومنے لگتے تھے، کوّوں کی آوازیں مسلسل آئے جاتیں۔ کبھی کوّوں کی چونچ میں تنکے ہوتے، کبھی کیکر کی چھوٹی چھوٹی خشک

www.taemeernews.com

ٹہنیاں۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ یہاں ان کا گھونسلا ہے۔ یہ بات مجھے دینو نے بتائی تھی۔ دینو کو بہت ساری باتیں پتہ ہوتی تھیں، کوّوں، کبوتروں اور پتنگوں کے بارے میں، راستوں اور لوگوں کے متعلق، میں سن سن کر حیران ہوتا تھا کہ یہ اسکول بھی نہیں جاتا، پھر اسے سب کچھ کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ نیم کی پھننگ پر سے چیں چیں کی آوازیں آنے لگیں تو اس نے بتایا کہ گھونسلے میں انڈوں سے بچّے نکل آئے ہیں، اور کوّا انہیں چوگا بھرانے جاتا ہے۔ کوّے کے بچے کیسے ہوتے ہوں گے، میں بہت حیران ہوتا تھا۔ دینو نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے گھونسلا اتار کر کوّے کے بچّے دکھائے گا۔ میں نے اسے اپنا رنگین پنسلوں کا ڈبا دے دیا اور کہا کہ امی کو مت بتانا۔ اب میں اس گھونسلے کی ٹوہ میں رہنے لگا، اس لمحے کے انتظار میں جب دینو نیم پر چڑھ کر گھونسلا اتارے گا اور میں کوّے کے بچے دیکھوں گا۔ میں نیم کے نیچے ٹہل ٹہل کر کوّوں کو آتے جاتے اڑتے دیکھتا رہتا۔ کبھی کوّا چونچ میں کچھ دبا کر آتا، گھونسلے سے چیں چیں کی آوازیں تیز ہوجاتیں اور کوّا خالی چونچ لیے واپس اڑ جاتا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ کوّے کے ساتھ اڑ کر اس کے گھر تک جاؤں اور اس کے بچّوں سے مل آؤں۔ مگر میں نیم پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ مجھے ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔ نیم پر تو دینو چڑھ جاتا تھا، اتنی پھرتی سے کہ ابھی نیچے تھا اور ابھی ڈال ڈال پات پات ہوتا ہوا اوپر کھڑا انگوٹھا دکھا رہا ہے۔

یہ شاید اسی دن ہوا تھا جب دینو کے سر پر استرا پھروایا گیا تھا۔ امی نے کہا تھا دینو کے پاس جا کر نہ کھیلنا، اس کے سر میں جوئیں ہیں۔ ان جوؤں کی وجہ سے دینو کا بھید اور گہرا معلوم ہونے لگا۔ اس کا سر مٹی کے تیل سے دھلوایا گیا، جس سے اس کی آنکھوں میں مرچیں لگی تھیں، پھر اس کے سارے بال اتروا دیئے گئے تھے اور وہ نئی اٹھنی جیسا چمکتا ہوا سر لیے ہر طرف دوڑتا پھر رہا تھا۔ اسی دوپہر کو وہ بلّی کی طرح نیم پر چڑھنے لگا۔ چڑیاں بھرا مار کر اڑیں اور کوّے شور مچاتے ہوئے نیم کے گرد منڈلانے لگے۔ جوں جوں وہ اوپر چڑھتا جاتا، کوّوں کی کائیں کائیں کا شور بلند ہوتا جاتا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوّے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ کوّے نہیں ہیں، لوگ ہیں جو چیخ رہے ہیں، الزام لگا رہے ہیں، اپنے گھر میں چور کو گھستے ہوئے دیکھ کر محلے کے سارے لوگوں کو اکٹھا کر رہے ہیں۔ اور ان کے پکارنے پر کوّے، بہت سارے کوّے، چاروں طرف سے اڑتے چلے آ رہے تھے۔ دینو کی ٹانگیں اور پاؤں نظر آ رہے تھے۔ جو شاخوں پر اس طرح چڑھ رہے تھے جیسے وہ سیڑھیاں ہوں۔ کوّوں کا شور سن کر امی باہر آ گئیں اور انھوں نے دینو کو آواز دے کر منع کیا، لیکن وہ ٹہنیوں کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ کوّوں کی چیخ پکار، امی کا ڈانٹنا اور دینو کے ہنسنے کی آواز.... اب وہ پھننگ کے قریب تھا جہاں جا کر کٹی ہوئی پتنگیں پھنستی تھیں۔ اس نے اوپر کی کچّی ٹہنیوں کو جھکایا اور کوئی چیز ٹپ سے میرے قدموں میں آ گری۔ تو یہ تھا کوّے کا بچہ، میں حیران کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ بالکل گیگلا سا، جیسے گوشت کی بوٹی اور چھیچھڑا، اس کے اوپر

www.taemeernews.com

ہلکے ہلکے سفید روئیں کے نشان، مچی مچی آنکھیں اور ننھی سی چونچ کھلی ہوئی، اس کے نہ بازو ہلے نہ حلق سے چیں چیں کی آواز آئی۔ میں اسے زمین پر پڑے ہوئے تکتا رہا اور جب تک دینو پیڑ سے اتر کر آیا، کوّے کے بچے پر چیونٹیوں کی قطار لگ چکی تھی۔

کوّے سے دینو کی دشمنی کا آغاز اسی لمحے سے ہوا۔ اس نے وہ بچہ ہتھیلی پر اٹھالیا اور مجھے دکھانے ہی لگا تھا کہ ایک جھپاکا ہوا اور کوئی چیز زن سے اڑتی ہوئی گزر گئی۔ یہ کوّا تھا۔ کوّا جھپٹا مار کر اپنا بچہ لے گیا اور باقی کوّے دینو کے گرد منڈلانے لگے۔ ایک کوّا تیر کی طرح اڑتا ہوا آیا اور دینو بلبلا کر رہ گیا۔ کوّے کی مضبوط چونچ سے زور کی چوٹ لگی تھی۔ پھر تو جیسے کوّوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک اڑتا ہوا آیا اور ٹھونگ مار کر اڑ گیا، ابھی اس کے حملے سے دینو سنبھل نہ پاتا کہ دوسرا کوّا آ کر چیل جھپٹا مار جاتا۔ کوّے بپھرے ہوئے ہجوم کی طرح اس پر چڑھ دوڑے تھے۔ اس نے دونوں بازو بچاؤ کے لیے اوپر اٹھا دیے، پھر بھی کوّوں نے نہ چھوڑا اور وہ چیختا چلاتا گھر کی طرف بھاگا۔ راستے میں کوّوں کی پنکھ اس پر طمانچوں کی طرح برستے رہے۔

اس کے بعد سے تو اس کا قدم باہر نکالنا دوبھر ہو گیا۔ دیواروں پر اور چھجوں پر کوئی نہ کوئی کوّا بیٹھا اس کی جاسوسی کرتا رہتا۔ جوں ہی دینو نے دہلیز پار کی، کوّے نے کائیں کائیں شور مچا کر پوری کوّا برادری کو خبر کر دی۔ کوّے پر سمیٹے، تیر کی طرح آتے اور ٹھونگ مارتے ہوئے اڑ جاتے۔ دینو کا گنجا سر ٹھونگوں سے چھلنی ہو گیا، خون جم جم کر کھرنڈ بن گیا مگر کوّوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے سر پر پگڑی بھی باندھ کر دیکھ لی، لیکن ادھر اس کا پاؤں باہر آیا اور کوّے اسے نوچنے کھسوٹنے کے لیے کائیں کائیں کرتے چلے آئے۔ وہ لاکھ ہش ہش کرتا، کوّے ہنکاتا، لیکن کوّے ایک ڈھیٹ اور سیانے، اس کے سر پر منڈلاتے ہی رہتے اور ٹھونگ مارنے سے نہ چوکتے۔ میں بھی دینو کے ساتھ ہی کھڑا تھا مگر کوّا کہار نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں۔

یہ میں ہی تھا جس کے پیچھے وہ پڑا ہوا تھا۔ وہ جس وقت کھڑکی کی کگر پر آن کر بیٹھا ہے اور اپنے گول گول دیدے گھما کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا، تو وہ دراصل میری ہی ٹوہ میں تھا۔ وہ روٹی کے باسی ٹکڑے یا کھانے کی جھوٹن تو ہرگز نہیں ڈھونڈ رہا تھا، جینے کہ میری بیوی کا خیال تھا۔ وہ مجھے ہی گھور رہا تھا۔ اس کا سر ایک جگہ ساکت تھا، گول دیدہ میری جانب مسلسل تکے جا رہا تھا۔ اس کی نظر میں تحقیر تھی، استہزاء تھا۔ اس کی سخت چونچ بھنچی ہوئی تھی۔ وہ موت کی طرح خاموش تھا۔ اور اٹل۔ چونچ کے کنارے اگے ہوئے بال بلّی کی مونچھوں کی طرح کھڑے تھے۔ اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ فقط اس کی آنکھ گھوم رہی تھی .... جہاں جہاں میں جاتا میرے پیچھے پیچھے۔ وہ مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں بھانپ رہا تھا۔ اس کی کینہ توز نظروں سے مخاصمت ٹپک رہی تھی۔ دشمنی، انتقام! پہلے میں نے اس خیال کو ہی

www.taemeernews.com

جھٹک دینا چاہا کہ محض ایک کوّا ہے، کیا کر لے گا۔ مگر اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں مسلسل میرا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ کھڑکی کی گگر پر ایسے بیٹھا میری طرف ٹکر ٹکر کیوں دیکھ رہا ہے۔ وہ لب پر تول رہا ہے۔ وہ ایک لمحے میں فیصلہ کرے گا اور مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ اس کی آنکھ حرکت کر رہی تھی اور مونچھوں کے بال ایک لمحے کے لیے پھڑکے۔ مکّار کہیں کا! میں نے نفرت سے تھوک دیا، بدگوشت کھانے والا! مجھے تھوکتا دیکھ کر وہ چوکنا ہوا، اس کا جسم تن گیا، جیسے وہ ابھی پرواز کرے گا، لیکن وہ پھر بیٹھ گیا اور میری نگرانی کرنے لگا۔ ابھی وہ کمرے کے اندر آجائے گا.... مجھے معلوم ہے.... اور میرے کندھے پر بیٹھ جائے گا۔ میں کندھے اچکاؤں گا، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوگا اس کے پنجے میرے شانوں میں گڑ جائیں گے، میں چیخوں گا، چلّاؤں گا، دنیا کے لوگوں کو مدد کے لیے پکاروں گا.... تب وہ میری طرف دیکھے گا، بہت محبت اور دلار کے ساتھ، جس چاؤ کے ساتھ وہ انار کی شاخ پر کھلنے والے دہکتے برخ شگوفے کی طرف دیکھتا ہے، نوچنے سے پہلے، پھر اس کی مضبوط، سخت چونچ میری آنکھ میں کھب جائے گی اور میں چیختا رہ جاؤں گا....

نام کیا ہے؟

ٹالم ٹولا (امی مجھ سے پوچھتی جاتیں اور میں جواب دیتا جاتا)۔

کھاتے کیا ہو؟

گھی کا گولا

رہتے کہاں ہو؟

(اب اتنے دن بعد یاد نہیں کہ اس وقت اس کا جواب دیا تھا)

بیوی کہاں ہے؟

میکے میں

لاتے کیوں نہیں؟

آتی نہیں

مارتے کیوں نہیں؟

دل کی پلالی ہے۔

میری اٹکتی ہوئی زبان سے "دل کی پیاری" کے الفاظ صاف ادا نہیں ہوتے تھے۔ "دل کی پلالی" سن کر امی ہنستے ہنستے میری گدگدیاں کرنے لگتیں اور میں اپنے پیٹ کو ان کی چھیڑتی ہوئی انگلیوں سے بچانے کے لیے دوہرا ہو جاتا۔

کوّے سے میرا تعارف امی نے ہی کرایا تھا۔ میں کھانے میں ضد کرتا تھا تو وہ مجھے ڈراتی

www.taemeernews.com

تھیں "کھالو نہیں تو کوّا آجائے گا"۔ وہ نوالہ بنا کر میرے آگے لے آتیں اور جھوٹ موٹ پکارتیں، "کوّے آنا تو...." اکثر کوّا آ بھی جاتا تھا۔ وہ نیم سے سیدھا اڑتا ہوا آتا اور دیوار پر بیٹھ کر کائیں کائیں پنکھ پسارنے لگتا۔ میں جلدی سے امی کے کہنے کے مطابق بڑا سا منہ کھول کر نوالہ اچک لیتا۔ پھر کوّے کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے چوری چوری دیکھتا۔ وہ مجھے دیکھ کر کائیں کائیں کیے جاتا۔ اس کوّے سے مقابلے کی ٹھان کر میں نے کتنے وقت روٹی کھائی تھی۔

دینو کی ماں کہتی تھیں کہ گھر کی دیوار پر کوا بولے تو گھر میں کوئی آنے والا ہوتا ہے۔ امی اس کی باتوں پر ہنستی تھیں۔ امی نے بتایا تھا کہ جب کوئی آنے والا ہوتا ہے تو کوّا نہیں آتا، ٹیلیفون آتا ہے۔ لیکن میں نے خود کوّے کو ٹیلی فون کے تار پر بیٹھے ہوئی دیکھا تھا۔ یا شاید دینو کی ماں والا کوّا اور ہو گا۔ امی نے بھی تو ایک اور کوّے کے بارے میں سکھایا تھا۔ شام کو جب میں پیچھے والے پارک سے کھیل کر آتا تھا تو امی مجھے پڑھاتی تھیں۔ میں ٹوپی اوڑھ کر اور نیکر سے نکلی ہوئی ٹانگوں پر تولیہ ڈال کر عم کا سیپارہ پڑھتا تھا، پھر وہ والی کتاب جس میں کوّے کی کالی اور سفید تصویر بنی ہوئی تھی۔ تصویر کے سامنے لکھی ہوئی عبارت میں جھوم جھوم کر پڑھتا جاتا:

کوّے ہیں سب دیکھے بھالے
چونچ بھی کالی پر بھی کالے
کالی وردی ان کی
اچھی خاصی ان کے ڈھب کی

کوّے کی طرح یہ کتاب بھی اس کتاب سے مختلف تھی جو اسکول میں مِس پڑھاتی تھیں۔ اس میں اور طرح کے سبق تھے۔ اسکول والی کتاب کا کوّا بھی اور تھا۔ مس کہتی تھیں یہ "کرو" ہے۔ اس کو پیاس لگتی ہے تو وہ مٹکے میں کنکر ڈال کر پانی کی سطح بلند کر لیتا اور بھوک لگتی تو فاکس کی جھوٹی تعریف کر کے اس کے منہ سے بریڈ اینڈ بٹر حاصل کر لیتا۔ اس کتاب میں رنگین تصویریں تھیں اور اس کے کاغذ سے امی کے پرس میں رکھے ہوئے نئے نئے نوٹوں جیسی خوشبو آتی تھی۔

رات کو بھی میں کوّے کے بارے میں سنتا تھا۔ امی میرا سر سہلا کر کہانی سناتیں تو اس میں بھی کوّے کہیں سے آجاتے۔ (یہ کوّے ہر جگہ تھے، میں ان کو اڑا دوں گا۔)

"تب راجا نے غصے میں کہا کہ جاؤ اسے لے جا کر کوّے ہنکنی بنا دو۔ نوکرانیاں رانی کو لے گئیں، اس کے سب گہنے پاتے، کپڑے لتے چھین لیے اسے ٹاٹ کا جھولا پہنا دیا، اس کے منہ پر راکھ مل دی اور ہاتھ میں ڈنڈا تھما دیا۔ رانی دن بھر محل سے کوّے ہنکایا کرتی...."

بے چاری رانی! اس کا قصور تو نہیں تھا جس کی راجا نے اسے سزا دی۔ اور وہ بھلا کوّے

www.taemeernews.com

کیسے اڑاتی ہو گی؟ کوّے تو اتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں .... ایک کو اُڑاؤ دوسرا آ جاتا ہے، پھر اڑاؤ پھر آ جاتا ہے .... میں بڑا ہو جاؤں گا تو پارے ماموں کی ایئر گن لے کر ان کو چھروں سے اڑا دوں گا۔ پھر رانی کو کوّے نہیں ہنکانے پڑیں گے"۔ "نہیں بیٹا تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم اس ایئر گن سے کسی پرندے کو نہیں مارو گے۔ جان دار کو بلاوجہ مارنے سے گناہ ہوتا ہے۔ یہ بے زبان کوستے ہیں".... کوئی پرندہ نہیں .... کوے بھی نہیں ....

کوّے جان دار بھی ہوتے ہیں اور ان کا ماتم بھی ہوتا ہے، یہ مجھے بعد میں پتہ چلا۔ میرا مارا ہوا پہلا کوا سامنے پڑا تھا اور سینکڑوں کوّے کائیں کائیں کرتے اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ اب یہ دشمنو کی طرح مجھ پہ حملہ کریں گے۔ لیکن میرے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں نے ہوا میں چھرے چلائے اور اندر آ گیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔

میری نیند میں بہت سے کوّے تھے۔ کالے بھجنگ، اڑتے ہوئے، منڈلاتے ہوئے، بوٹیاں نوچتے ہوئے، ٹھونگیں مارتے ہوئے کوّے، اور ان کی چبھتی ہوئی آواز کہاں ہے کہاں ہے کاں اے کاں اے کائیں کائیں .... میں نے آنکھیں میچ لیں، تکیہ سر پر رکھ لیا اور سو گیا۔ سوتے ہوئے میں نے اس کی آواز سنی۔ کُٹر .... کوئی کچھ کھا رہا ہے۔

کون ہے؟

ہم کاگ داس۔

کیا کھا رہے ہو؟

کھیلیں بتاشے ....

یہ کھیلوں بتاشوں کی کٹر کٹر نہیں تھی۔ یہ جبڑوں میں پستی ہوئی ہڈی کی آواز تھی۔ کوا میرا گھر بار کھا رہا ہے۔ اس نے مینا کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ نیند میں گھلی ہوئی وہ ممتا بھری آواز پھر گونجنے لگی۔

"مینا کا گھر موم کا تھا اور کوّے کا نمک کا۔ مینہہ جو پڑا تو کوّے کا گھر بہہ گیا۔ مینا نے دیکھا کہ کوّا بے گھر ہوا رات بے رات بارش میں بھیگ رہا ہے، تو اس کا دل پسیج گیا۔ اس نے پچھلی باتیں بھلا دیں اور کوّے کو آواز دی "کوّے میاں کوّے میاں، میرے گھر میں رات بسر کر لو۔" مینا نے پھاٹک کھول دیا اور کوّا اندر آ گیا۔ ذرا دیر بعد مینا کو اونگھ آ گئی تو کوّے نے چن چن کر مینا کے بچوں کو کھانا شروع کر دیا۔ مینا نے پوچھا کوّے میاں کوّے میاں یہ کٹر کٹر کیا کھا رہے ہو۔ کوّے نے کہا میرے سسرال سے لونگ سپاری آئی تھی وہ کھا رہا ہوں۔ مینا کہا اچھا اور آنکھیں موند لیں۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو گھر صاف۔ مینا کی دنیا اندھیری ہو گئی ...."

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اچانک سارے کوّے اڑ گئے اور اندھیرا چھٹ گیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ میرا ماتھا جل رہا تھا۔ جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اتنا

www.taemeernews.com

بھاری بوجھ، اور جلتا ہوا .... جیسے کمہار نے دہکتی ہوئی انگارہ کھرپی میرے سینے پر رکھ دی ہو۔ کیوں؟ میں نے بے چین ہو کر کروٹ بدلنی چاہی، مگر کھرپی کے بوجھ تلے حرکت نہیں کر سکا۔ اس نے میرے سینے پر کھرپی کیوں رکھ دی؟ میں کاگ داس نہیں ہوں، میں نے چڑیا کے بچے نہیں کھائے۔ میں نے کمہار کے پاس جا کر لال سرخ کھرپی نہیں پسند کی۔ اسے میرے سینے پر سے ہٹاؤ۔ دیکھو پر جلنے کی بو آ رہی ہے، میرا گوشت جل رہا ہے، میری چربی پگھلی جا رہی ہے، میں کاگ داس نہیں ہوں، نہیں ہوں .... اور پھر وہی نیند اور اندھیرے کے بھنور میں ہچکولے کھاتی ہوئی آواز بوجھل آنکھوں کے پردے ہٹاتی ہوئی: "کوّے نے چڑیا سے کہا کہ میں ایک شرط پر تمہاری بات مان سکتا ہوں کہ صبح ہوتے ہیں تم مجھے اپنا ایک بچہ کھانے کو دے دینا۔ چڑیا بے ہاری مجبوراً مان گئی۔ جب صبح ہوئی اور کوّا چڑیا سے اس کا بچہ مانگنے آیا تو چڑیا نے کہا پہلے اپنی چونچ تو دھو کر آؤ، تمہاری چونچ کالی ہے۔ کوّا اڑتا ہوا ندی کے پاس پہنچا اور ندی سے کہا ندی ندی، تم ندی داس، ہم کاگ داس، دیو پنلا، دھوئیں چونچلا، کھائیں چڑی کے چینچلے اور منکا دیں کلا۔ ندی نے کہا بہت اچھا، گھڑا لاؤ اور جتنا پانی چاہیئے بھر کر لے جاؤ....

کوّا ندی کے پاس سے اڑ گیا، وہ گھڑا لینے جا رہا ہو، ابھی پانی بھرے گا، چونچ دھوئے گا، اور چڑیا کا بچہ مانگنے آ جائے گا۔ وہ آئے اور بچہ ہڑپ کر لے گا۔ میرا ننھا سا دل سکڑ جاتا۔ امی کہتی تھیں، میں کہانی سنتے سنتے پیلا پڑ جاتا تھا۔ اب کیا ہو گا، چڑیا کے بچے کو کاگ داس سے کون بچائے گا؟ بڑھتی ہوئی کہانی کے ساتھ ساتھ کوّا چڑیا کے بچے کو چٹ کرنے کے قریب آتا جا رہا تھا اور میں سہمتا جا رہا تھا۔ چڑیا کی بپتا مجھ سے سہی نہیں جا رہی تھی۔ میں اس بلبل کے لیے بھی بہت کڑھتا تھا، ہاتھی والا جس کی بات سنے بغیر گزر گیا تھا۔

بلبل کو مالی نے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا اور پنجرہ ٹہنی پر ٹانگ دیا۔ باغ کی ہوا لگی تو بلبل کو ہوش آیا۔ بلبل نے دیکھا کہ باغ کے سامنے سے ایک آدمی ہاتھی پر جا رہا ہے۔ بلبل نے اسے پکارا.....

ہاتھی والے بتیارم تم رم تم رم تم
میرے بچے چھوٹے ہیں
بارش پڑے گی بہہ جائیں گے
بھوک لگے گی مر جائیں گے رم تم رم تم

ہاتھی والے نے اس کی بات نہیں سنی اور سامنے سے گزر گیا۔

ہم گھونسلے میں پڑے بلک رہے تھے اور امی موٹر والے بتیا کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ موٹر زن سے گزر جاتی۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ابو دھند اور دھوئیں میں کھو جائیں گے اور میں سالگرہ کے دن آنسو پی کر یہ سوچتا رہ جاؤں گا کہ میرے ابو ہسپتال سے واپس آئیں گے تو میں

www.taemeernews.com

بھی نئی کلاس کی ریڈر خریدوں گا، دوسرے بچّوں جیسے چمکتے ہوئے جوتے پہنوں گا، ابو اسپتال سے کب واپس آئیں گے ہاتھی والے بھّیا؟

ابو کا منہ لال ہو رہا تھا رُم تم رم تم اور وہ سینے پر سے بار بار بوجھ سا ہٹانا چاہتے تھے جیسے وہ لال سرخ کھرپی ان کے سینے پر رکھی ہو۔ اور پھر ان کا منہ جو لال ہو رہا تھا سیاہ ہو گیا، اس کوّے کی طرح جب اس نے لال کھرپی اپنے پروں پر رکھ لی تھی۔

ابو تو آئے بھی نہیں اور کوّا اڑتا ہوا گائے کے پاس پہنچا، دھرتی کے پاس گیا اور دھرتی نے اسے کمہار کے پاس بھیج دیا۔ کمہار سے اس نے کہا کمہر کمہر، تم کمہر داس ہم کاگ داس .... کمہار نے کہا یہ دو کھرپیاں رکھی ہیں، ایک کالی اور ایک لال، جو چاہئے لے لو۔ کوّے نے کہا میں تو لال لال لوں گا۔ کوّا کھرپی کی طرف یہ کہتا ہوا بڑھا کھائیں چڑی کے چینچلے منکا و س کلا۔ لال کھرپی کمہار نے ابھی بھٹی سے نکال کر رکھی تھی۔ وہ تھی گرم انگارہ........

"تم کو کئوّا کاٹے گا" جب میں ضد کرتا تھا تو دینو مجھے دھمکاتا تھا۔

"کئوّا ...." دینو کے حلق سے یہ لفظ یوں نکلتا تھا۔ حلق میں بھی کوّا ہوتا ہے، امی نے مجھے بتایا تھا۔ امی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے میرا منہ کھلوایا تھا، زبان باہر نکلوائی تھی اور کہا تھا کہ آ .... آ .... بولو تاکہ میں حلق کا کوّا دیکھ لوں۔ پھر انھوں نے میرے حلق میں ٹارچ کی روشنی ڈالی تھی جیسے سرنگ میں ڈالتے ہیں، انھیں اس سرنگ میں کوّا نظر آیا تھا؟

"اس کا حلق ٹھیک ہے"۔ انھوں نے امی کو بتایا۔ "یہ اٹک اٹک کر جو بولتا ہے کہ اس کی وجہ غالباً کوئی صدمہ ہے جس کا یہ اظہار نہیں کر پاتا"۔ انھوں نے کوے کا ذکر کیوں نہیں کیا، میری سمجھ میں یہ ساری باتیں نہیں آئیں۔ میں بس ڈاکٹر صاحب کی ٹارچ سے کھیلتا رہا، اس کو کھل بند کھل بند کر کے جل بجھ جل بجھ ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دینو کی ماں نے کہا اس کی زبان کے نیچے کنکر رکھو تب یہ ٹھیک بولے گا۔ امی چھوٹے چھوٹے کنکر چن لائی تھیں، ننھے منے، کنکر جیسے کتاب والے کوّے نے مٹکے میں ڈالے تھے۔

کوئی میں پیاسا کوّا ہوں؟ میں نے امی سے پوچھا تھا۔

میری زبان کے نیچے گول کنکریاں رکھ دی گئیں۔ میرے حلق کا کوّا حرکت کرتا تھا اور میں پریشان تھا کہ اگر میں بولا اور میرے حلق سے آواز آئی کائیں کائیں........

الماری کے آئینے پر چڑیا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پنجے آئینے کی ہموار چمکیلی سطح سے پھسلے جا رہے تھے۔ اور وہ اپنے عکس پر چونچیں مارے جا رہی تھی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی کہ یہ اپنے

www.taemeernews.com

علس کو دوسری چڑیا سمجھ رہی ہے، میں نے اسے اڑانے کی کوشش کی تھی مگر وہ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر پلٹ آتی۔ مسلسل اڑنے اور ہنکائے جانے سے اس کی ننھی سی چونچ کھل گئی، پوٹا ہل رہا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کو ہنکاتے ہوئے میں بھی پسینے پسینے ہو گیا۔ گرمی جو لگی تو میں نے پنکھے کے سوئچ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چڑیا اڑی اور چلتے ہوئے پنکھے کے راستے میں آ گئی۔ چڑیا پنکھے کی آہنی پنکھڑیوں سے کٹ گئی۔ خون کے چھینٹے دیواروں پر، آئینے پر فوارے کی طرح پھیلنے لگے۔ کٹی ہوئی چڑیا پنکھے ہی میں الجھی ہوئی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا اور چڑیا کے خون سے سارے کمرے میں چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ گھر گھر گھومتے ہوئے پنکھے سے آواز آ رہی تھی کاگ داس، کاگ داس.....

۱۹۸۶ء

ooooo

www.taemeernews.com

مِن شرِّ ما خلق

www.taemeernews.com

*

دہلیز خون سے سرخ تھی۔

ہمارے دروازے پر اب بھلا کون آئے گا۔ اور کیوں۔ دستک سن کر میں نے یہ بھی نہیں سوچا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ کچھ سوچے سمجھے، محسوس کیے بغیر، کٹھ پتلی کی طرح تیزی سے اٹھ کر میں نے کنڈی سرکا دی اور دونوں کواڑ دھڑ سے کھل گئے۔ (بعض دفعہ مجھ سے اچانک ہوجانے والے واقعات کی گھبراہٹ میں ایسی باتیں سرزد ہوجاتی ہیں جو نہیں ہونی چاہئیں۔ پھر مدتوں ان کے ہو جانے کا پچھتاوا۔۔۔۔) دروازے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے کئی بار جھانک کر دیکھا۔ کھلے دروازے کی اوٹ سے پھیلتی ہوئی سنسان گلی میں چڑھتے ہوئے دن کی تیز دھوپ جھلملائی اور آنکھوں میں چبھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسی لمحے یہ لگا کہ دھوپ بھرا سناٹا تھم جائے گا اور اس میں سے وہ دستک دینے والا اور چھپ جانے والا ابھر کر آئے گا اور ہم سب ششدر رہ جائیں گے۔ دستک کس نے دی تھی، مجھے وہ ہاتھ دکھائی نہیں دیے۔ شاید وہ گلیوں میں اڑنے والا گرد کا بگولا ہو، یا کوئی شریر بچہ، میں نے اپنے تیز تیز دھڑکتے ہوئے دل کو باور کرانا چاہا۔ مگر اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے میرے لہجے میں بے یقینی تھی، کیوں کہ میرے دل کو اندر ہی اندر خبر تھی کہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ گمبھیر ہے۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے دروازہ بھیڑ دینا چاہا کہ یہ خوف باہر ہی رہ جائے لیکن زنجیر ہاتھ سے بار بار پھسل جاتی تھی۔ کواڑ بند نہیں ہوئے۔ دروازہ چرچرانے لگا۔ میں نے حیران ہو کر اس بند نہ ہونے والے دروازے کی طرف دیکھا۔ تب میری نظر اس پر پڑی۔ عین اس جگہ جہاں میرے پاؤں تھے۔ وہ وہیں تھا۔ جیسے اس کسی نے میرے قدموں میں لاکر ڈال دیا ہو۔ کیا میں نے اسے ٹھوکر ماری تھی یا روندا تھا؟ میرے سیدھے پیر کا انگوٹھا اس خون سے آلودہ ہو بھی چکا تھا۔ چپکے چپکے جس کا خون میرے پاؤں تک آن پہنچا تھا، وہ سر تھا۔ کسی جانور کا کٹا ہوا سر۔ دہشت کے مارے میری آنکھیں مچ گئیں۔

گھر کی دہلیز پر بکرے کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھول دیں۔ وہ غائب نہیں ہوا۔ وہ وہیں تھا، اتنا واضح کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا، اور اس قدر حقیقی کہ میرے یہ دعا مانگنے کے باوجود کہ یہ یہاں نہ ہو، وہ وہاں موجود تھا، گوشت، ہڈی اور خون کی دہشتناک، اٹل موجودگی۔۔۔۔ اس کو گردن کے پاس سے کاٹا گیا تھا۔ کاٹنے والے کا چاقو کند تھا۔ یا اس کا ہاتھ صاف نہیں تھا، کیوں کہ گردن ایک برابر سے نہیں کٹی ہوئی تھی۔ کاٹنے والے نے کئی جگہ سے کوشش کی تھی، اور ناکام ہو جانے پر وحشت کے ساتھ اسے بھنبھوڑا تھا۔ (انتہائی خوف کے عالم میں بھی، یہ تفصیلات میرے حواس میں اتر رہی تھیں، جیسا کہ ہمیشہ

www.taemeernews.com

اترتی آئی ہیں، یہ یاد رہ جاتی ہیں اور بعد میں خوف کو بڑھاوا دیتی رہتی ہیں۔) بے طرح ادھڑے ہوئے نرخرے میں لہولہان لال کچی چیخیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ مٹیالے، لمبوترے کان چھوٹے چھوٹے سینگوں کی جڑوں میں سے نکلے ہوئے تھے، اور ان ہاتھوں کی طرح ایک طرف کو ڈھلکے ہوئے تھے جن کی جان نکل چکی ہو۔ کچی لال لتھڑی ہوئی زبان منہ سے باہر نکل آئی تھی، اور چوڑے چوڑے دانتوں سے بھرا ہوا جبڑا اس کے اوپر سختی کے ساتھ بھنچا ہوا تھا۔ کٹے ہوئے سر کا یہ حصہ بھیانک طور پر کسی انسان کا معلوم ہو رہا تھا۔ دانتوں سے عاری کسی آدمی کے لیے بنائے گئے مصنوعی جبڑے جو مضحکہ خیز بھی تھے اور خوف ناک بھی۔۔۔ مصنوعی اور گندی بتیسی جو اپنا باقی ماندہ چہرہ گم کر چکی ہو۔ اور آنکھیں بھی مصنوعی تھیں۔ وہ کانچ کی بنی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پرانا کانچ جس کی چمک پھیکی پڑ چکی ہو۔ ایک ہی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہوئی کانچ کی گولیوں جیسی پیلی پیلی آنکھیں۔ وہ کون سا منظر تھا جو ان میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گیا تھا؟ میرا خوف سے پیلا پڑتا ہوا چہرہ یا اپنے گلے پر چھری پھیرنے والے کی سفلگی؟

ان پیلی آنکھوں میں ایک سیاہ نقطہ سمٹا ہوا تھا۔ مٹی میں دبے ہوئے، ٹوٹے پرانے کنچوں جیسی یہ آنکھیں مسلسل میری جانب دیکھے جا رہی تھیں۔ میرے لیے اپنے آپ کو ان کی طاقت سے باہر نکالنا ممکن نہیں تھا۔ میں سحر زدہ معمول کی طرح ان کے سامنے کھڑی رہی۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اور خوف کی ایک لہر تھی جو میرے تن بدن کی گہرائیوں میں، پیٹ کے اندر کہیں، امڈ رہی تھی۔ اب یہ لہر کروٹیں بدلتی ہوئی دھیرے دھیرے سطح پر آئے گی اور طوفان کی طرح پھٹ پڑے گی۔ پھر میرے لیے خود کو سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔ لیکن میری آنکھیں بے بس تھیں کہ اس کٹے ہوئے سر کو تکے جائیں اور اس کے نقوش کی ایک ایک تفصیل میرے بے حس حافظے پر نوک بن کر اتارتی، گودتی چلی جائیں۔

پھر دفعتاً اس کٹے ہوئے سر کو دیکھ کر مجھے اطمینان سا ہوا۔ جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ خوف کو بالآخر ایک شکل مل گئی تھی۔ اب اسے پہچاننا آسان تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ اندھیرے کمروں میں تاریک پرچھائیاں بن کر پیچھا کرتا تھا۔ دیواروں سے جھانکتا تھا اور رات گئے شب خون مارتا تھا۔ اب اسے ایک جسم مل گیا تھا، ایک کٹا ہوا سر۔ بکرے کا یہ کٹا ہوا سر پہلی علامت تو تھی نہیں۔ لیکن یہ پہلا اشارہ تھا جو اتنا کھلا ہوا تھا۔ جس وقت یہ سب شروع ہوا تھا تو محض ایک احساس تھا، دبا دبا شبہ جسے کوئی نام دینا مشکل تھا، جسے پوری طرح محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دونوں وقت ملتے جب سارا گھر جھٹپٹے سے بھر جاتا تو اچانک دل بیٹھنے لگتا کہ کیا ہوگا۔ جانے اب کیا ہوگا۔ غیر مرئی دہشت کا ایک احساس تھا، بیٹھے بیٹھائے بلاوجہ طاری ہو جانے والی کپکپی جو دیر تک قابو میں نہیں آتی تھی اور نامعلوم کی ہیبت جس کی وجہ سے سارے بدن پر سوئیاں چبھنے لگتیں۔ پھر وہ پتھر کی طرح سن اور بے حس ہو جاتا۔ مگر وہ جو کچھ تھا کبھی سامنے آیا

www.taemeernews.com

نہیں۔ اس سر سے پہلے۔ وہ وہاں گھات لگائے بیٹھا تھا، اس گھر کے در و دیوار میں رسا بسا ہوا تھا۔ یہ اس نے ہم پر آہستگی مگر بے حد قطعیت کے ساتھ عیاں کر دیا تھا، ایک دفعہ بھی سامنے آئے بغیر۔ پھر اس کے بال جھڑنے لگے تھے۔ گھر کے کونے کھدروں میں، جہاں ایک دیوار دوسری کو سختی کے ساتھ بھینچے ہوئے ہوتی، غسل خانوں کے فرش پر اڑتے ہوئے اور فرنیچر کے پائے سے اٹکے ہوئے، گھر بھر میں بھٹکتے پھرتے ہوئے بال ملتے تھے۔ بالوں کے گچھے۔ گول گول لپٹے ہوئے لمبے لمبے بال۔ پہلے پہل میں نے انہیں اپنا سمجھا۔ شاید یہ بال میرے ہی ہیں، جو بے خیالی میں جھڑ جاتے ہیں، یا نہا کر کنگھی کرتے ہوئے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مجھے ملال بھی ہوا کہ بچپن میں اماں جان نے کس طرح آنولے کا تیل لگا کر اور ریٹھوں سے دھو کر اتنے بڑے کیے تھے کہ چوٹی کمر تک آتی تھی اور اب بال اترتے اترتے یہ چوہیا سی دمچی رہ گئی۔ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگتی، انہیں فرش پر سے چن کر اٹھا لیتی، ان پر تھتھکار کر چولہے میں رکھ دیتی۔ ان کو جلانا ضروری تھا، کیوں کہ اماں جان سے یہی سنا تھا کہ بالوں میں تاثیر ہوتی ہے، انہیں کسی غیر کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیئے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سو طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ جتنے بال ملتے میں چولہے میں جلا دیتی مگر بالوں نے آنا بند نہیں کیا۔ میری تمام چیزوں میں بال ہی بال ہونے لگے۔ مسہری پر ٹوٹے ہوئے بال پڑے ملتے۔ تکیے پر کٹے ہوئے لچھوں کی طرح یا کنڈلی مارے ہوئے نظر آتے۔ کپڑوں کی الماری میں گچھے کے گچھے ملتے، جو پٹ کھولتے ہی اڑ جاتے۔ میں ان کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی تو وہ اڑ کر اور آگے چلے جاتے۔ کئی مرتبہ پانی کے کٹورے میں سے بال ہٹایا۔ شفاف پانی کی سطح پر سانپ کی طرح رینگتا ہوا بال۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پانی کی سطح ٹوٹ گئی ہے۔ مگر پانی ٹوٹا نہیں تھا، اس میں بال پڑا ہوا تھا۔ ایک اور دفعہ روٹی کے برتن میں سے بال نکلے۔ میں جس چیز کو ہاتھ لگاتی اس میں سے چھوٹے چھوٹے بال لپٹے ہوئے نکلتے۔ اس وقت تک مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ یہ بال میرے نہیں ہیں۔ میں پھر بھی نہیں سمجھی۔ مجھے یہی خیال ہوا کہ کوئی بیماری ہے جو بال اتر رہے ہیں۔ شاید مجھے بال تور ہو گیا ہے۔ میں نے انڈے کی زردی پھینٹ کر سر میں ملی۔ میں ان بالوں کی بیماری سمجھی۔ میں نے انہیں اس وحشت سے ہم رشتہ کر کے نہیں دیکھا جو مجھ پر رہ رہ کے طاری ہو جاتی تھی۔ بیتے ہوئے دن آنکھوں میں گھوم جاتے۔ جی چاہتا تھا کہ دنوں کا یہ گھومتا چمکیلا پہیار کے، ان لمحے کے لیے پڑے میں اس پرانی متحرک تصویر میں داخل ہو کر ان دنوں کے بہاؤ میں شامل ہو جاؤں جیسی اس وقت تھی، ویسی ہی بن جاؤں۔ لیکن میرے دل کی کسک کی پروا کیے بغیر تصویروں کا یہ سلسلہ گھومتا رہتا، میں تڑپتی رہ جاتی۔ اور گھر میں بال گرتے رہتے۔

پھر بال آنا بند ہو گئے تھے۔ اب اس کٹے ہوئے سر کے سامنے کھڑی تھی تو وہ ٹوٹے ہوئے بال ایک ایک کر کے واپس آ رہے تھے، چبھ رہے تھے۔ اب یہ ساری باتیں جڑ رہی تھیں کہ جو کچھ

www.taemeernews.com

ہوتا رہا تھا، اس سب میں ایک تعلق تھا۔ اس وقت میں نے اسے روزمرہ ہونے والی معمولی باتوں کا حصہ سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا۔ مگر اب ساری بات کھلتی جارہی تھی، قالین میں بنے ہوئے نقشے کی طرح۔ بکرے کی مردہ آنکھیں مجھے گھورے جارہی تھیں۔ کتنی دیر تک وہ وہاں پڑا رہا۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ اس کے پاس جاؤں اور اسے اٹھا کر پھینک دوں۔ میں اسے چھو نہیں سکتی تھی۔ وہ سامنے تھا، اسے جھٹلانا ممکن نہیں تھا، لیکن جی چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو۔ جیسے ابھی یہ غائب ہو جائے گا یا جس نے یہ ہول ناک مذاق کیا ہوگا وہ کسی پیڑ کے پیچھے سے دیوانہ وار قہقہے لگاتا ہوا نکل آئے گا اور مجھے بودے پن کا طعنہ دے کر اسے ہٹا لے گا کہ یہ تو جھوٹ موٹ کا ہے۔ میں اس موہوم سی امید پر اسے تکتی رہی کہ کوئی اسے نقلی ثابت کر کے مجھے تسلی دے گا۔ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرانے لگیں لیکن اس میں جنبش تک نہ ہوئی۔ تب مجھے اس احساس نے سہمانا شروع کیا کہ یہ یہاں آیا کیوں۔ یہ خود بخود تو نہیں آیا ہوگا۔ اسے کسی نے ڈالا ہوگا اور ضرور بری نیت سے ڈالا ہوگا۔ کوئی ہم پر سفلی عمل کر رہا ہے؟

بالوں کے بعد سوئیاں آنا شروع ہوئی تھیں۔ باغ کے ایک کونے میں، جھاڑیوں کے پتوں میں چھپی ہوئی، کیاری کی مٹی میں آدھی دبی ہوئی سوئیوں کا گچھا۔ میں شک میں پڑ گئی کہ مجھ سے ہی گری ہوں گی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر (اس کٹھ پتلی کی طرح جو میں بنتی جارہی تھی) میں نے انہیں اٹھالیا اور دھاگے کی گٹی کے پاس رکھ دیا جیسے انہیں ان کی مناسب جگہ مل گئی ہو۔ اور اطمینان سے ہو گئی۔ اگلے دن وہ پھر وہاں تھیں۔ وہاں اور بہت سی جگہوں پر۔ مجھے سارے گھر سے اتنی سوئیاں مل رہی تھیں جو میں نے زندگی بھر میں گم نہیں کی تھیں۔ یہ اب لوٹ کر میرے پاس کیوں آرہی تھیں؟ اور سوئیوں کے بعد یہ کٹا ہوا سر۔ اس سے خون ٹپک رہا تھا۔ دہلیز سرخ ہو گئی تھی اور خون کی بوندیں باغ کی طرف بہہ رہی تھیں۔ میں نے ان کے نشانات کے ساتھ آخر تک چل کر نہیں دیکھا کہ میرے سامنے وہ بے حس و حرکت کانچ کی آنکھیں تھیں۔ جن کا میری جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ دیکھتا ہوا شیشہ میرے جسم میں اترنے لگا، میرے خون میں گھل گیا اور گھل کر رگوں میں جمنے لگا۔ پھر دھچکا سا لگا اور وہ کچا شیشہ جو پوری طرح جما نہ تھا چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس کے پیچھے تھما ہوا خوف موج مارتا ہوا امڈا اور اس کے ایک ہی تھپیڑے کے آگے میں کپڑے کی گڑیا کی طرح جھول گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ دیکھنے والوں نے بتایا کہ میری گھگھی بندھی ہوئی تھی، زبان باہر نکل آئی تھی، دانت پر دانت جمے ہوئے تھے اور ساکت آنکھیں خلا میں تکتی ہوئی، ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ٹوٹا ہوا کانچ۔

ایک، دو، تین، چار.... اب کی بار کئی دن اوپر ہو گئے تھے۔ کئی مرتبہ سے مہینہ گڑبڑ ہو رہا

www.taemeernews.com

تھا۔ ورنہ ہمیشہ پورے دنوں پر آتا تھا۔ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ آج خون آنے والا ہے۔ اور آتا بھی اسی طرح سے تھا۔ وہی پہلے دن ہلکے ہلکے سرخ دھبے، اس کے بعد پورا پورا خون جس پر چھوٹے کپڑے رکھنے پڑتے تھے۔ خون آتا بھی ایک برابر تھا۔ نہ بہت کم نہ بہت زیادہ۔ اس کے آنے کا جو دن ہوتا تھا میں اس کی آمد کا اہتمام کرنے لگتی تھی۔ اس دن طبیعت گری گری ہوجاتی، بدن نڈھال، کبھی ہلکی سی حرارت رہ جاتی، مگر بخار نہیں چڑھتا تھا۔ آنکھیں بھری بھری لگتیں، ایک عجیب سی بے قراری ہوتی کہ نہ اس کل چین نہ اس کل چین، کبھی جی مالش کیے جاتا، وہاں بھی ذرا سا منہ کھل جاتا، کچھ بھرا بھرا سا لگتا کہ کسی طرح نکل جائے تو چین پڑے۔ جب خون پورا ہوجاتا تو طبیعت کی سستی غائب ہوجاتی۔ خون آتا بھی پورے چاند کے حساب سے تھا۔ چاند گھٹتا جاتا اور خون کا دن قریب آنے لگتا۔ چاند چھوٹا ہوتے ہوتے آسمان سے غائب ہوجاتا تو خون آنا شروع ہوجاتا اور جب خون کا بہاؤ پورا ہوچکا ہوتا تو اس کے بعد آسمان میں نیا چاند نظر آتا، باریک اور پتلا، کٹے ہوئے ناخن جیسا۔ میں اسی کو دیکھ کر دعا مانگتی، پانی گرم کر کے نہاتی اور دوبارہ نماز پڑھنے لگتی۔ لیکن اس مرتبہ چاند گھٹا، گھٹتے گھٹتے غائب ہوا، راتوں کے گھپ اندھیروں میں ستارے پھیکے پھیکے معلوم ہونے لگے، یہاں تک کہ یک بیک مشرقی افق میں پتلا سا چاند نمودار ہوا (جس کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی) لیکن میرے خون پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں دن میں کئی کئی بار چھوٹے کپڑے کھول کھول کر دیکھتی تھی کہ کہیں بے خبری میں خون جانا شروع تو نہیں ہوگیا مگر باسی خون کے بھورے جمے ہوئے دھبے نظر نہیں آئے، نہ طبیعت گری گری ہوئی نہ خون بہا کر ہلکی، نہ بدن ایسے ٹوٹنا شروع ہوا کہ اعضا تھکن سے شل ہوجائیں اور لہو میں تھما ہوا جوش ابل کر تسکین پا جائے۔ میں اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی، وہ نہ آیا اور آسمان میں چاند چڑھتا گیا۔ کیا ہوگیا تھا؟ خون رک کیوں رہا تھا؟ میرے بدن میں چڑھتے چاند کے ساتھ لہو کا جوار بھاٹا تھم کیوں گیا تھا؟ پھر مجھے یاد آیا کہ پچھلے مہینے بھی دن اوپر نیچے ہوگئے تھے۔ میرے حساب سے تو دن پورے ہوگئے تھے۔ لہو نہیں بہا تو میں نے نہا کر نماز پڑھنی شروع کردی۔ نماز پڑھتے میں رکوع سے سیدھی ہو کر سجدے میں جو جانے لگی تو ایسا لگا کہ کچھ گیلا گیلا چپک رہا ہے، ٹانگوں اور کولہوں پر سے ہوتا ہوا بہہ رہا ہے۔ ایک دھار نکل رہی ہے، جو ابھی ٹپک جائے گی۔ یہ کہیں سے امڈ رہی ہے، بوند بوند گر رہی ہے۔ گھبراہٹ میں نیت ٹوٹ گئی۔ ازار بند کھول کر دیکھا تو خون تھا۔ خون کی آمد لیکن کیسے؟ مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں متعجب ہوگئی۔ میں نے اسے انگلی سے چھو کر دیکھا۔ خون گاڑھا ہوچلا تھا۔ مگر جمنا شروع نہیں ہوا تھا۔ انگلی کی پور اس سے رنگ گئی، اور میں نے اسے فرش پر رکھ کر دبایا تو خون کی تحریر میں انگلی کا نشان ابھر آیا میں چونک پڑی۔ میرا جی دہل گیا کہ جاء نماز بھی گندی ہوگئی، نماز قضا ہوئی سو الگ۔ دل بے اختیار رونے لگا کہ میں ایسی پلید

www.taemeernews.com

بندی ہوں کہ خدا کی عبادت کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ میرے سجدے بھی اتنے ناپاک ہو گئے کہ اپنے مکروہ بدن کو جس مقام پر لے جاتی ہوں اسے نجس کر ڈالتی ہوں۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ مہینہ گڑبڑ ہوا تو میرے دل میں اور ہی خیال آیا.... بنیادی خیال جو بہت پہلے آنا چاہیئے تھا۔ اچانک میرے دماغ میں کوندا سا لپکا کہ مہینہ گڑبڑ ہونے کی ایک ہی تو وجہ ہوتی ہے--- میں نے پہلے کیوں نہیں سمجھا، مجھے حمل ٹھہر گیا ہے۔ مدہوش کر دینے والی خوشی کی ایک لہر میرے اندر گرم چشمے کی طرح پھوٹنے لگی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ مجھے بچہ ہونے والا ہے.... بچہ، مجھے، آخر کار۔ میں نے بہت اطمینان اور تسلی بلکہ تفاخر کے ساتھ سوچا تھا کہ اسے میری کوکھ کے عضلات نے روک ہی لیا، وہ جو پھسلواں چکنی مچھلی کی طرح مہینے کے مہینے اپنی ممکنہ آمد کے نشان بھیجتا اور میری خالی کوکھ سے ہوتا ہوا گزر جاتا، جیسے کوکھ نہ ہو چھلنی ہو جس میں کوئی چیز ٹھہرنے نہ پائے، جو آئے آر پار گزر جائے اور اس کے گزر جانے پر میری کوکھ آنسو بہانے لگتی، خون کے آنسو بوند بوند ٹپکنے لگتے۔ پھر چھوٹے کپڑے بھیگ جاتے اور بستر کی چادر پر صبح کے وقت بھورے بھورے دھبے اس کبھی نہ روکنے والے مہمان کے سراغ بن کر جمے ہوتے۔ میں خوشی سے پھولی نہ سمائی کہ اب وہ رک گیا ہے۔ وہ پکڑ میں آگیا ہے۔ اب اتنے دن خون کے آنسو نہیں ٹپکیں گے۔ سارا خون اس کے پاس جو چلا جائے گا کہ اس کا بھرا بھرا بدن بن سکے، ایک بچے کا بدن، میرے بچے کا بھرا بھرا گدیلا بدن! میرا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مجھے چومنے لگا۔ اس کی نرم گلابی ہتھیلیوں سے گدگدی ہونے لگی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ میری کھال سے ہولے سے مس ہو گئے۔ اس کے نرم لمس سے میرے پیٹ کے عضلات سکڑنے لگے۔ چھاتیاں بھر آئیں۔ سینے میں ہلکا سا گڑھا پڑنے لگا تھا اور اس میں دودھ بھر گیا۔ میں نے انگلی سے اس کے لب وا کیے اور اپنی تنی ہوئی چھاتی اس کو چھوا دی۔ اس کے ہونٹوں نے گدگدایا تو سر سے پیر تک کپکپی دوڑ گئی، سارا بدن سنسنا اٹھا، پھر دودھ کی دھار اترنے لگی۔ میں نے اپنی طرف رشک سے دیکھا تھا کہ میں نے اسے پا ہی لیا۔ اب مجھے ادھورے پن کی وہ خلش نہ ہوگی، میں خوش رہ سکوں گی۔ مجھے احساس تو تھا کہ میں کس قدر چڑچڑی ہو گئی تھی۔ بات بات پر الجھ پڑتی تھی اور کوئی مجھے کچھ کہہ دیتا تو گھنٹوں بیٹھی اپنی محرومیوں کا حساب آنسوؤں سے چکاتی تھی۔ وہ سامنے آتے تھے تو جھنجھلا کر رہ جاتی تھی۔ بچہ نہ ہونے میں وہ بھی تو برابر کے قصوروار تھے۔ ہر رات وہ مجھ میں پتلے سانپ کی طرح سرسراتے ہوئے داخل ہوتے۔ میں آسیب میں مبتلا عورت کی طرح لرزا اٹھتی تھی اور ان کی مرضی پر ہاتھ پاؤں پٹخنے لگتی تھی۔ (میں کٹھ پتلی بنتی جا رہی تھی)، وہ سانپ میرے گرد کنڈلی مار لیتا، اور سانپ آنکھوں کی طلسمی کشش میں کھنچتی ہوئی چڑیا کی طرح میں خود کو ان کے زہر بھرے دانتوں سے کٹتے ہوئے، اس کے چکنے غلیظ حلق میں اترتے ہوئے، اور اس کی زندانی آنتوں میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس کرتی۔ ابکائی لینے کے

www.taemeernews.com

لیے منہ کھولتی اور ان کا بساندھ بھرا بوسہ وصول کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ ان کے ڈھلکے ہوئے گوشت پر پسینہ چپچپاتا اور ہزاروں سانپ مجھے ڈسنے لگتے، پیہم ڈسے جاتے۔ سانپ کے منہ میں اتنی سی زبان، نکیلی اور گیلی، زبان کے سرے پر ایک بوند رکی ہوئی۔ مگر وہ بوند جیسی جاتی ویسی ہی لوٹ آتی۔ وہ بوند کبھی ٹپکی نہیں۔ وہ کبھی گہرائی تک پہنچی بھی نہیں، بالکل اندر تک جہاں سے میں پگھلتی تھی اور میرا خون بے قرار ہو کر ابلتا تھا۔ اس جگہ کو کسی نے کبھی نہیں چھوا جہاں میرا بچہ گہری نیند سوتا تھا کہ اس پانی کی بوند پڑے اور وہ ہمک کر میری کوکھ میں آجائے۔ میں اپنے اندر کا سارا زور لگا کر اس بوند کو اوپر کھینچ لانا چاہتی تھی، کھینچنے کی کوشش میں سمٹ سکڑ کر ہانپ جاتی اور روز وہ بوند اس جگہ تک پہنچے بغیر رہ جاتی جہاں میرا بچہ اپنی نیند میں سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس دستانے کی طرح محسوس کرنے لگی تھی جس میں داخل ہو کر اسے صحیح شکل دینے والی انگلیاں نہ ہوں، جن کے بغیر وہ تڑا مڑا نظر آتا ہو۔ میری جڑیں پیاسی تھیں اور میری سیپ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اب میں خوش ہو گئی کہ میں بھرپور ہو گئی۔ بھر بھر گئی۔ میں اتنی خوش تھی کہ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ خون کب بہنے لگا۔ وہ ٹانگوں سے بہتا ہوا بوند بن کر فرش پر ٹپکا تو میں نے چونک کر دیکھا، اور انتہائی شدید مایوسی کے ساتھ پہچانا کہ یہ لہو میرا ہے اور یہ کہاں سے آتا ہے۔ میں رونا چاہتی تھی، اسے پونچھنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ بھی میرے آنسوؤں کی طرح ہے۔ لیکن آنسو فراوانی سے بہتے تھے۔ یہ رک رک کر آتا تھا۔ اور آتا ہی رہا، اس وقت بھی جب آنسو خشک ہو گئے۔ میں روز چھوٹے کپڑے بدلتی تھی اور اگلی صبح وہی گیلے رنگ کے سے دھبے، بھورے مٹیالے، ملگجے اور سوکھ کر کھرنک ہوئے۔ پھر میں نے چیزوں کو گندہ کرنا شروع کیا۔ میں جس جگہ بیٹھ جاتی اسے گیلا کر کے اٹھتی۔ کرسیاں صوفے، قالین، بستر، مسہریاں، گدے، سب میں سے مجھ سے مس ہو جانے کے بعد ایک سیلی ہوئی گرم بو اٹھنے لگتی۔ باسی خون کی نمکین بساندھ۔ اس کا بہاؤ اتنا خفیہ اور نامحسوس تھا کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلتا اور جگہ گندی ہو جاتی۔ پھر خون کے بہاؤ نے اپنا احساس دلانا شروع کیا۔ بیٹھے بیٹھے اپنی شلوار کو بھیگتے ہوئے اور ٹانگوں پر دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی گیلی لکیر کو محسوس کرنے لگی۔ خون خاموشی کے ساتھ بہتا ہوا ٹانگوں سے گزرتا ہوا ٹپک جاتا میں ہلتے ہوئے ڈرتی تھی کہ اس کا بہاؤ تیز نہ ہو جائے اور وہ ہو بھی گیا۔ باڑھ پر آئی ہوئی ندی کی طرح۔ یہ بھل بھل بہتا پھر سوکھ جاتا۔ وہی بھونسلے نشان اور چپچپاتی ہوئی سیلی ہوئی گرم بو۔۔۔۔ اسے کتا بھی سونگھ سکتا تھا۔ وہ سوں سوں کرتا ہوا میرے پاس آجاتا میرے کپڑوں پر تھوتھنی مل مل کے منہ گھسانے کی کوشش کرتا اور مجھے اس کو دھکیل کر دور کرنا پڑتا۔ وہ پالتو ضرور تھا مگر اس سے پہلے کتے کو مجھ پر اس قدر پیار کبھی نہیں آیا تھا۔ جس وقت میں دودھ میں ڈبل روٹی چوا کر اس کے لیے پیالے میں رکھتی، یا ابلے ہوئے چھیچھڑے کا قیمہ اس کے سامنے ڈالتی تھی تو وہ پیروں میں منہ

www.taemeernews.com

دے کر لوٹتا دم ہلاتا اور تشکر بھری آوازیں نکالتا ہوا لپ لپ کھانے لگتا۔ لیکن اب وہ مجھے سونگھ رہا تھا۔ میرے جسم کی بو پر ناک لگا رہا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھی تھی، دم سادھے ہوئے کہ کہیں زیادہ ہلنے جلنے سے خون نہ آنے لگے، کہ وہ مجھ پر لپکا۔ اس نے پچھلے پیر میرے پنجوں پر ٹکائے اور کوں کوں کرتا ہوا مجھے سونگھنے لگا۔ میں نے اس کی نم، سیاہ ناک کو پرے دھکیلنا چاہا، لیکن اس نے اچھل کر اپنے اگلے پنجے میرے کاندھوں پر ٹکا دیے اور اپنی لمبی زبان نکال کر مجھے چاٹنے لگا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے دھکیلا تو وہ بھاگ گیا۔ باہر باغ کی طرف۔ کئی دن سے وہ ایسی عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ وہ اوندھا ہو کر ہوا میں پنجے چلاتا رہتا، بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا، نظر نہ آنے والی کسی چیز پر لپکتا، اٹھ اٹھ کر بھونکتا، سنائی نہ دینے والی چاپ پر کان کھڑے کر لیتا اور مکان کی دیواروں کے گرد گھومتا رہتا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ رات کو روتا نہیں تھا، ساری رات ادھر ادھر گھومتا پھرتا، اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کونوں میں منہ ڈال ڈال کر نہ معلوم کیا دیکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر وہ بھاگا۔ دروازوں کو منہ سے دھکیلتا ہوا، فرش پر پھسلتا ہوا، گیلے گراتا ہوا، گھاس کو روندتا ہوا چیزوں سے ٹکراتا ہوا اور انگور کی بیل کھودنے لگا جہاں کچھ دن پہلے مٹی پر خون کے دھبے نظر آئے تھے، اور میں نے سمجھا تھا کہ یہ پتہ نہیں کیا ہے۔ وہ پنجوں سے دیوانہ وار زمین کھود رہا تھا اور منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکال رہا تھا۔ پھر اسے وہ مل گیا جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ اسے منہ میں دبا کر اندر لے آیا اور میرے قدموں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ پیاز کی گٹھی تھی۔ اس پر گیلی مٹی لگی ہوئی تھی۔ گٹھی سفید تھی، بالکل سفید، جیسے لہو نچڑا ہوا چہرہ۔ وہ کچھ دیر اسے تکتا رہا پھر واپس بھاگا۔ دیوانہ وار بھونکتا ہوا۔ اس نے باغ میں پھر پنجوں سے زمین کھودنی شروع کر دی۔ وہ کسی آسیب زدہ جانور کی طرح زمین کھودے جا رہا تھا۔ اسے جو ملا وہ پھر منہ میں دبا کر لے آیا اور قالین پر ڈال دیا جہاں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر میری نظر اس طرف سے ہٹ نہیں سکی۔ وہ موم کا پتلا تھا۔ اس کے موی چہرے پر جو ناک نقشہ بنایا گیا تھا۔ وہ مانوس تھا۔ بہت مانوس۔ اس کے سینے پر موم سے دو چھوٹی چھوٹی چھاتیاں بنا دی گئی تھیں کہ شناخت میں کسی غلطی کا امکان نہیں رہے۔ اور ٹانگوں کے بیچ میں رستا ہوا گڑھا تھا۔ اس کے سارے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ باریک باریک سوئیاں جنہوں نے اس کا انگ انگ چھید ڈالا تھا۔ اس کے باریک بنے ہوئے ہونٹوں پر ذرا سا خون لگا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر خون ملا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا۔ جانی پہچانی گرم بساندھ چھوڑتا ہوا باسی گندہ خون۔۔۔

اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب وہ آئے گا۔ خوف اور بے بسی کے مارے میرا سارا بدن سن ہو جاتا ہے۔ شام ہی سے مجھے سہم چڑھنے لگتا ہے کہ جوں ہی اندھیرا پھیلے گا، وہ آ جائے گا اور میں پھر مجبور

www.taemeernews.com

ہو جاؤں گی۔ وہ منتظر رہتا ہے۔ کہیں دبکا ہوا اور چھپ کر بھی مجھے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے کہ مجھے ذرا غافل پائے اور چڑھ دوڑے۔ میں اس سے بچنا چاہتی ہوں مگر بچ نہیں سکتی۔ میں دیکھتی رہ جاتی ہوں اور وہ مجھ پر آن پڑتا ہے۔ دن کے اجالے میں کتنی کوشش کرتی ہوں کہ وہ دکھائی دے جائے۔ ایک دفعہ اسے دیکھ تو لوں۔ دیکھ لوں تو شاید اس کی بابت کچھ کر بھی سکوں۔ اس سے ڈر مجھے اسی لیے لگتا ہے کہ وہ اندھیرے میں مجھے چھوتا ہوا مجھ پر پھیل جاتا ہے۔ دن میں بھی یہیں کہیں ہوگا، اور اس کے علاوہ وہ ہو بھی کہاں سکتا ہے۔ کسی دیوار پر، کونے کھدرے میں، فرش پر رینگتے ہوئے، کھڑکی کی کگر سے دروازے کی چوکھٹ پر جاتے ہوئے اسے دیکھ لوں اور لپک کر اسے مٹھی میں بند کر لوں، پکڑ کر اسے مسل ڈالوں، پیروں تلے دبا کر اتنا پیسوں کہ اس کے بدن کا پانی نکل جائے، وہ کچل کر جوتی کے نچلے حصہ سے مری ہوئی مکڑی کی طرح چپک جائے۔ لیکن وہ کبھی نظر نہیں آتا۔ میں دیواروں کو چپکے چپکے ٹٹولتی رہتی ہوں، تکیے کے نیچے اور بستر کی تہوں کو بار بار جھٹک۔ دیکھتی رہتی ہوں، اس امید پر کہ شاید وہ پکڑا جائے۔ صبح سے ڈھونڈتے ہوئے شام ہو جاتی ہے، اندھیرا پھیلنے لگتا ہے اور اس کے آنے کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو مجھے پہلے سے پتہ چل جاتا ہے۔ ایکا ایکی سارا گھر سناٹے کی زد میں آ جاتا ہے، خاموشی ہوا کی طرح سائیں سائیں کرتی ہوئی خالی کمروں میں بہنے لگتی ہے۔ دیواریں چپ سادھ لیتی ہیں، کھڑکیوں میں جڑے ہوئے منظر سانس روکے کھڑے ہیں، گھر کی چیزیں دم بخود ہیں۔۔۔۔ پھر ایسا لگتا ہے کہ سارا سناٹا محور کے کسی ایک نقطے پر آ کر تھم گیا ہے۔ تب وہ آتا ہے۔ عین اسی لمحے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے، ہاتھ پاؤں کانپ جاتے ہیں، ہتھیلیاں ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جاتی ہیں اور پیٹھ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں۔ جیسے وہ پیچھے کھڑا ہوا اپنی چبھتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہو۔ دھیرے دھیرے گردن موڑ کر دیکھتی ہوں۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ صرف اندھیرا ہے۔ سیال اندھیرا جس میں ہزاروں آنکھیں چھپی ہوئی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آ گیا ہے۔ ہوا اس کے احساس سے معمور ہے۔ وہ اس اندھیرے میں ہے۔ وہ موقعے کی تاک میں ہے۔ آنکھ بچے اور وہ چھلانگ لگائے گا۔ میرے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ ایک خفیف سا لمس۔۔۔ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں؟ ٹانگ سے کچھ ہولے سے مس ہو جاتا ہے۔۔۔ یہ وہی ہے! وہ آ گیا۔۔۔ وہ آ گیا۔۔۔ وہ کچھ دیر یہیں جما رہے گا، اس گوشے کو سہلاتا رہے گا حتی کہ اس کے روئیں روئیں میں جھنجھناہٹ دوڑ جائے گی، کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں کی طرح، تب وہ آہستہ آہستہ اوپر سرکنا شروع کرتا ہے، ٹانگ کی ساخت کے ساتھ چمٹا ہوا، رینگتا ہوا، درخت کے تنے پر رینگنے والے چیونٹے کی طرح ۔۔۔ اور جہاں سے وہ چھوتا ہوا گزرتا ہے، مجھے پتہ چل رہا ہے۔ ایک سنسناہٹ سی اٹھتی ہے۔ بے چینی کا ایک احساس ہے جو نس نس میں جاگتا جا رہا ہے۔ اس کے نشان کے طور پر سرخی کی ایک لکیر بن رہی ہے۔ اس لکیر

www.taemeernews.com

میں سلسلاہٹ ہو رہی ہے۔ اس کے زہر بھرے ڈنک سے جلد پر خراشیں پڑ گئی ہیں اور ان میں سوزش ہو رہی ہے۔ اب اس میں کھجلی ہو رہی ہے۔ میں اس پر انگلیاں پھیرتی ہوں۔ چین نہیں پڑتا۔ سارے میں مرچیں سی لگے جاتی ہیں۔ بے پناہ کھجلی۔ ناخونوں سے کھجا کھجا کر نوچ ڈالوں کہ خون بہہ جائے۔

ایک دفعہ میں وہاں ہاتھ لگا دوں کہ ٹھنڈک پڑ جائے، لیکن ہمت نہیں ہوتی کہ کھجانے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں۔ ورنہ پھر وہ ہاتھ پر آجائے گا، انگلیوں کو پل کی طرح پار کرتا ہوا، کہنی کی گولائی سے پھسلے گا، بازوؤں پر چلے گا، خارش کی طرح پھیلتا ہوا وہ سینے پر آجائے گا۔۔۔ یہی تو اس کا مقصد ہے۔۔۔ وہاں کاٹے گا، اپنے سینکڑوں، ہزاروں دانت میرے گوشت میں اتار دے گا، وہاں ددوڑے پڑ جائیں گے، لال لال جلتے ہوئے ددوڑوں سے سارا سینہ بھر جائے گا۔۔۔ نہیں اسے سینے سے دور ہی رکھوں تو اچھا ہے۔ میں کھجانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گی۔ میں ٹانگوں کو سختا لیتی ہوں۔ لیکن کھجلی کسی طرح نہیں رکتی۔۔۔ وہ ٹانگ پر دھیرے دھیرے چڑھ رہا ہے۔ جہاں جہاں سے وہ گزرتا ہے نسیں دھات کے تار بن جاتی ہیں جن میں سے برقی رو گزاری جا رہی ہو۔ ٹانگ میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگتی ہیں۔ پھر وہ جلنے لگتی ہیں۔ تپ کر دہک جاتی ہیں۔ وہ پھر اسی طرف جارہا ہے۔ دیکھو وہ پھر اسی طرف جارہا ہے، وہ پھر وہاں سے رستے ہوئے گندے خون میں منہ ڈالے گا۔ وہ پھر وہی کرے گا، نہیں، نہیں، اسے روکو۔۔۔

وہ یوں ہی گھپ اندھیروں سے نکل کر جسم کے کسی حصے پر رینگنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھے پتہ ہی اس وقت چلتا ہے جب سلسلاہٹ کی ایک لکیر دوڑنے لگتی ہے۔ جسم کا اتنا حصہ پہلے سن ہوجاتا ہے، پھر وہاں کھجلی ہونے لگتی ہے، جو ہلکے ہلکے بڑھ کر وحشیانہ خارش بن جاتی ہے۔ کہ اگر ناخونوں سے کھرونچ کھرونچ کر اتنے حصے کو ادھیڑ نہ ڈالا تو چین نہیں آئے گا۔۔۔ اچانک وہ حصہ ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے، جلتی ہوئی رگوں میں کوئی کچلی ہوئی برف بھر دیتا ہے۔ ٹھنڈک سے پھر سارا عضو سن پڑ چکا ہوتا ہے۔ اور اتنے میں وہ چلتا ہوا آگے وہاں پہنچ چکا ہوتا ہے۔ جوں ہی مجھے اس کا لمس وہاں کے نازک مساموں پر محسوس ہوتا ہے میں خوف اور شرم کے مارے کانپ اٹھتی ہوں، فوراً اسے جھٹکنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن اس کے نظر نہ آنے والے پنجے کھال میں مضبوطی سے گڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ میری جلد کپکپا اٹھتی ہے، سکڑنے لگتی ہے لیکن وہ دہانے پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے، پھر وہی کام شروع ہوجاتا ہے ندامت کے مارے جس کا نام بھی نہیں لے سکتی۔۔۔

وہ سکڑ کر دکھائی نہ دینے والی اور روئیں دار حیوانی گیند بن جاتا ہے اور میرے بدن پر پھسلنے لگتا ہے۔ وہ کئی دن سے ایسا کر رہا ہے۔ میرا بس بھی نہیں چلتا اور وہ آکر میرے جسم کو سہلا[illegible] دینے لگتا ہے۔ میں اس اجنبی لمس پر چونک اٹھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اسے اپنے

www.taemeernews.com

آپ سے پرے جھاڑ جھٹک دوں۔ لیکن میں اسے کیسے جھٹک سکتی ہوں جس کے بارے میں مجھے معلوم بھی نہیں کہ وہ ہے کیا بلا۔ مگر مجھے شک ضرور ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے۔ اسی لیے میں نے گھر کیل کروایا تھا۔ جن کیلوں کے اوپر دم کر کے پڑھا گیا ہو میں ایسی کیلیں لے کر آئی تھی۔۔۔۔ وہ بہت لمبی لمبی تھیں۔ اور ان کی نئی دھات چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ میں نے ان کو ہتھیلی پر رکھا تو وہ بہت بھاری تھیں اور ہتھیلی کی کٹوری میں آسانی سے ہل نہیں سکتی تھیں۔۔۔۔ اور انہیں گھر کے چاروں کونوں میں ایک ایک کر کے گاڑ دیا تھا۔ میں نے پہلے اس جگہ سے ذرا سی مٹی ہٹائی، مرے ہوئے پتے اور کنکریاں صاف کیں، پھر کیل کی نکیلی جڑ کو احتیاط کے ساتھ زمین میں اتار دیا اور کیل کے سر کو ذرا نیچے سے تھام کر اس احتیاط سے ہتھوڑی چلائی تھی کہ چوٹ کیل پر پڑے، میرے ناخونوں پر نہیں، ورنہ ناخون نیلے پڑ جائیں گے۔ ہتھوڑی کی ضربوں سے کیل زمین میں اتر گئی۔۔۔۔ ان گہرائیوں میں جہاں نامعلوم خوف جنم لیتا ہے۔۔۔۔ تو میں نے اوپر سے چھوٹے چھوٹے صاف پتھر ڈھک دیے۔ اب کوئی کچھ نہیں بتا سکتا، میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اب کوئی کچھ کر بھی نہیں سکتا، میں نے خوش ہو کر سوچا۔ اب میرے گرد حصار بن گیا ہے۔ اس شام جب اندھیرا پھیلا تو میں خوف زدہ نہیں تھی۔ بڑے دنوں کے بعد پہلی بار میں پورے اعتماد کے ساتھ شام اور اندھیرے کا سامنا کر رہی تھی۔ مجھے کیل کی قوت پر یقین تھا کہ وہ اسے الانگھ نہیں سکتا، کوشش بھی کرے گا تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔ وہ دور دور سے مجھے دیکھے گا اور تلملا کر رہ جائے گا۔ قریب آنا چاہے گا تو حصار کی طاقت اسے پرے دھکیل دے گی۔ مجھے اپنی طاقت اور اس کی بے بسی پر ہنسی آئی۔ اور ہنستے ہنستے میرا ہاتھ ٹانگ سے جا لگا۔ اور پھر فوراً ہی میں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا جیسے کرنٹ کا تار چھو گیا ہو۔ پھر خوف، شکست خوردگی، مایوسی اور خفت کا ایک ریلا آیا اور مجھے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ وہ وہاں موجود تھا۔ خاموش مگر کینہ توز۔ اس کی گرفت آج زیادہ سخت تھی۔ (یا مجھے ایسا لگ رہا تھا؟) اس کے لمس میں تضحیک تھی، میری کوششوں کے لیے حقارت تھی اور احساس قوت تھا کہ وہ مجھے تسخیر کر چکا ہے۔ میرے لیے اپنے آپ کو اس کے سامنے سرنگوں کر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ میں زمین ہوں اور وہ میرا فاتح۔ لیکن آج وہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ اس کے لمس میں وہ ابتدائی دنوں کی سی تڑپ نہیں تھی کہ ہر بن مو کو چوم چوم کر چاٹ لینا چاہتا تھا۔ اور وہ مخصوص نرمی، گندی، چکنی، غلاظت کی سی نرمی، وہ تنی ہوئی نرمی جو مردہ جھلیوں اور ذبح کیے ہوئے جانوروں کی اوجھڑی میں ہوتی ہے۔ آج وہ کھردرا سا محسوس ہوا، اس کے لمس میں لکڑی کو چھیلنے، گھسنے والے ریگ مال کی سی درشتی تھی۔ اور وہ تیز چل رہا تھا۔ اپنے ہزاروں نادیدہ پنجوں سے چلتا ہوا وہ بہت تیزی کے ساتھ اوپر چڑھ رہا تھا، جیسے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ وہاں سے رستے ہوئے خون سے اپنی پیاس بجھا کر ہی دم لے گا۔ وہ میری ٹانگوں، رانوں کو گھستا، چھیلتا ہوا گیا، اندر

www.taemeernews.com

گھسا، بہت زور کے ساتھ اپنے آپ کو ٹھونستا ہوا۔ جیسے وہ مجھ کو جتا رہا ہو کہ میں چاہوں تو اسے جھٹک کر دور نہیں پھینک سکتی اور مجبور ہوں کہ وہ اپنی مرضی سے آئے اور میری بدن کو جس طرح اس کا جی چاہے چھوتا، سہلاتا، کاٹ کاٹ کر دوروں سے بھرتا پھرے۔ اور خاص طور پر اسے گرم، گیلی جگہیں پسند تھیں۔ وہاں بیٹھ جاتا تو پھر جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ جانگھ پر، کولہوں میں، بغلوں میں کتنی دیر تک سلسلاہٹ ہوئے جاتی۔

اس خیال ہی میں کتنی وحشت تھی کہ کوئی میرے جسم کے ان حصوں کا معائنہ کر رہا ہے جو ڈھکے چھپے رہنے کے عادی ہیں، نہ صرف معائنہ کر رہا ہے، بلکہ ٹٹول رہا ہے، ان میں رہ رہا ہے جیسے وہ اس کی جاگیر ہوں۔ وہ کسی جرثومے یا طفیلی کیڑے کی طرح نہیں تھا کہ جسم میں پلتا رہے اور کسی کو پرواہ نہ ہو، اس نے ابتدا ہی میں عاشق کی طرح اس جسم سے، میرے جسم سے، لپٹنا شروع کیا تھا۔ اور اب وہ زبردستی کیے جا رہا تھا۔ وہ گستاخ اور بدتمیز تھا۔ وہ اپنی ہیکڑی جماتا تھا۔ ٹانگوں سے اچھل کر ہاتھ پر آجاتا تھا، بغلوں میں جھانکنے لگتا تھا، پسینہ بھرے بالوں کو چھیڑتا ہوا سینے پر کود جاتا، چھاتیوں کے بیچ میں پھدکنے لگتا، کبھی ایک کو سہلاتا کبھی دوسری کو۔ ان کو چومتا، مسوستا، چاٹتا، ان کے لٹکے ہوئے گوشت کو ہلا کر تھل تھل کرتے ہوئے محسوس کرتا، ان پر چٹکیاں لیتا، نوچ نوچ کر گھاؤ ڈال دیتا، ان کی چوٹی پر منہ لگا کر رگڑ دیتا۔ ان سے دودھ نہ ٹپکتا تو اپنے مسوڑھوں سے انہیں زبردستی چوس چوس کر سرخ کر دیتا کہ وہ سوج کر رہ جائیں۔ ان میں دکھن ہونے لگتی۔ اس کی بہتی ہوئی رال سے سارا سینہ لتھڑ جاتا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگتی۔ اور یہی سب حرکتیں وہ نچلے حصوں میں بھی کرتا تھا۔ کبھی زبان بن کر چومنے، چوسنے، چاٹنے لگتا، کبھی انگلی بن کر چھوتا، چھیڑتا، کبھی کچھ اور بن کر بدن میں کھب کھب جاتا۔ میں بے حال ہوئی جاتی ہوں۔ نہاتی ہوں تو وہ چھینٹیں اچھالتا ہے، سارے بدن پر پانی ملنے لگتا ہے، صابن کے جھاگوں کے ساتھ پھسلتا ہے۔ کپڑے پہنتی ہوں تو وہ سلوٹوں میں چھپ کر گدگدیاں کرتا ہے، سونے لیٹتی ہوں تو تکیے سے اتر کر کانوں میں چیختا ہے، تیز سیٹی جیسی باریک اور تکلیف دہ آواز میں دل کا لہو سرد کر دینے والی چیخیں۔۔۔۔ وہ ساری جگہوں پر ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ وہ آنے والا ہوتا ہے اور میں بھیگ بھیگ جاتی ہوں۔۔۔ اڑتی ہوئی ہانڈی آئی اور صحن میں جا گری۔ اس میں سے بھوبل اور چنگاریاں نکل کر بکھر گئے۔ ہانڈی کوری مٹی کی تھی۔ اس پر کسی نے گیرو پھیر کر اس کا رنگ گہرا کر دیا تھا۔ اس میں سے گری ہوئی راکھ صحن کے وسط میں ڈھیری بنی پڑی رہی۔ اس میں سے دھواں اٹھتا رہا۔ میں دھوئیں کی لکیر کو اٹھتے، لہراتے، ہوا میں غائب ہوتے تکتی رہی۔ دیوار پر چھریاں رکھی ہوئی تھیں اور صحن میں خون کے چھینٹے تھے، مرغیاں اور قینچیاں، بالوں کے گچھے اور پڑوس والے مرغے کا سر کٹا، تڑپتا پھڑکتا بدن جس کے سیاہ

www.taemeernews.com

پر دھوپ میں اس طرح چمک رہے تھے جیسے وہ سیاہ نہ ہوں ست رنگے ہوں، زرد پنجوں کے سرے پر سیاہ سرمئی مٹی بھرے ناخون مڑے ہوئے تھے۔ دونوں ٹانگوں کے درمیان ستلی بندھی ہوئی تھی اور گردن کے اوپر کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک زخم تھا بری طرح چھلا ہوا، لال کچا زخم۔۔۔ میں سب سے چھپاتی ہوں۔ لہو کے نشان کوئی نہ دیکھ لے۔ میرے شوہر کو پتہ نہ چل جائے کہ میرا تن بدن کسی اور کے بس میں ہے۔ میں چوروں کی طرح دبے پاؤں ادھر ادھر دیکھتی ہوں۔ میرا شوہر وہاں پہلے سے موجود ہے۔ وہ چور کو پکڑنے والا عمل کر رہا ہے۔ یا خدا اب میرا کیا ہوگا۔۔۔ وہ لاج وتی کے پتے ہاتھ میں داب کر میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا اور فوراً اپنی مٹھی بند کرلی۔ میں نے سینے پر نگاہ کی تو پستان بالکل غائب۔ اس نے ایک مٹھی کھول دی تو دوسرا موجود تھا۔ اس نے دوسری مٹھی بھی کھول دی تو پہلا بھی موجود تھا۔ ایک چراغ تانبے کا بنوایا اور سانپ کی کینچلی کی بتی بنا کر چراغ میں جلا دی۔ جب جب اور جہاں تک اس کی روشنی جاتی ہے تمام گھر میں سانپ ہی سانپ دکھائی دیتے ہیں، سانپ ہی سانپ اور خون۔ درخت سے پتہ توڑو تو ٹہنی سے خون ٹپکتا ہے، پانی کا گلاس لال لال لہو سے بھر جاتا ہے صراحی سے کٹورے میں انڈیلا جانے والا پانی لہو۔ حد تو یہ ہے کہ ہوا میں انگلی پھیرو تو سرخ بوند خون کی۔۔۔ پھر بھی وہ میرے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے کہ اچھا یہ گن ہیں اور مجھ سے لہو کا مطالبہ کرتی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ میرا یہ لہو فاسد ہے اور کیا اسے معلوم نہیں کہ خون بہنے کی حالت میں عورت کے پاس ان کاموں کے لیے جانا مکروہ ہے اور انجام اس کا برا ہے۔

عورت ذبح کی ہوئی بھینس کی طرح تڑپ رہی تھی اور اسے ابھی تک بچہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے درد میں مبتلا تھی اور زور لگا لگا کر نڈھال ہو چکی تھی۔ مگر کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا تھا۔ سارے کمرے میں اس بتی کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس سے چیزوں کے اصلی رنگ چھپ جاتے ہیں اور ان پر ایک نیلگوں ماورائی چمک آ جاتی ہے جس کا رنگ سارے خوابوں جیسا ہوتا ہے۔ بتی کی بھڑکتی ہوئی آنکھ کے نیچے جس میز پر اسے لٹایا گیا تھا، اس میز کی ترچھی ڈھال نیچے ڈوبی جا رہی تھی جہاں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی جست کی بالٹی میں پڑی ہوئی رطوبت کے اندر روئی کے پھونسڑے نکلے ہوئے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ وہ عورت ٹانگوں سے ننگی تھی اور ہسپتال کا نیلی دھاریوں والا یونی فارم اس کی ناف کے اوپر چڑھا دیا گیا تھا جس کے اندر بے طرح پھولا ہوا پیٹ کچے مٹکے کی طرح نکلا ہوا تھا، اور اس پر میلی میلی کھرونچیں پڑی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا جسم کا ان گھڑ برتن یہیں سے چٹخ جائے گا اور کوری مٹی جھڑنے لگے گی۔ پیٹ کے قطر پر ابھری ہوئی ناف چھوٹے سے غبارے کی طرح پھول رہی تھی اور درد کے لہر کے ساتھ اوپر نیچے

www.taemeernews.com

ہوتی جاتی۔ عورت کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے موڑ کر آہنی پلنگ کے پائنتی لگے ہوئے چمڑے کے تسموں سے باندھ دی گئی تھیں اور ان کا درمیانی حصہ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اندام نہانی مکھی کے ڈنک لگے ہوئے ہونٹوں کی طرح سوج گئی تھی اور چری ہوئی ٹانگوں کے درمیان کوئی چیز ہلتی ڈولتی جھلک رہی تھی۔ سانس روک کر اور پیٹ اینٹھا کر وہ زور لگاتی، ایک کلبلاہٹ آدھی ننگی چھاتیوں سے اترتی ہوئی جانگھ کے جوڑ میں گم ہو جاتی --- اور کچھ نہ ہوتا۔ ٹھنسا ہوا پیٹ یوں لگتا تھا کہ اب پھٹ پڑے گا۔ بہت دیر سے وہ زور لگا رہی تھی اور شدت کوشش سے اس کا بدن پسینے پسینے ہو کر نڈھال ہو رہا تھا۔ مسلسل مشقت سے تھکتے ہوئے بدن میں درد کی لہر امڈ کر آتی اور سارا جسم ایک بار پھر تن جاتا کہ بچے کو خارج کر دے جو اس میں نمو پاتا رہا تھا اور اب تیار تھا کہ ظاہر کر دیا جائے --- لیکن نیچے آتے آتے زور ٹوٹ جاتا، موج ساحل پر پہنچنے سے پہلے بکھر جاتی، اور جسم بچے کو یوں روک لیتا جیسے وہ ابھی مکمل نہ ہوا ہو، کچا رہ گیا ہو۔

میرے سامنے ایک اور عورت کھڑی تھی۔ اس نے سفید کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کی ناک سیاہ اور نم تھی اور وہ سامنے منہ کر کے بھونک رہی تھی:

"بی بی ٹانگیں ڈھیلی چھوڑو، لمبا لمبا سانس لو، زور مت توڑو، درد نیچے لو، پورا پورا، اور باہر نکالو، کاکس کا مافک----"۔

ٹانگوں کے بیچ میں سے کچے آم کا سا چیپ بہہ رہا تھا۔

وہ جھنجھلائے جا رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی سرنج تھی۔ سوئی کی چبھن کے ساتھ ایک ٹھنڈک سی اتری اور سارا پیڑو سن ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں قینچی تھی۔ چاندی کی طرح چمکتی قینچی سے اس نے میرا کلیجہ چاک نہیں کیا بلکہ سوجن کے نیچے قینچی چلا دی۔ چمکتی ہوئی قینچی چلی تو کھال کٹ گئی اور گوشت کی ایک پھانک کھل گئی۔ پھر سانس روک کر پورا زور، پورا زور--- مگر جسم بچے کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ زخم کے کھلے ہوئے منہ میں بچے کا سر یوں نظر آ رہا تھا جیسے پکے ہوئے پھل میں گٹھلی۔

میز پر لیٹے لیٹے درد کے تواتر سے بلند ہوتی کراہ لہر کی طرح اوپر اٹھتی پھر نیچے گر پڑتی تھی:

"اللہ جی--- اماں جی، میری اماں، اماں، ام آں آں ماں--- میں مر گئی--- ہائے رے---"

بھونکتی ہوئی عورت کا چہرہ اب اور سنگین ہو گیا۔ اس پر مصمم ارادہ جھلک رہا تھا اور اس کے ہاتھوں میں اب دھات کے آنکڑے تھے۔ اس کا ہاتھ اٹھا تو دھات بجلی کی روشنی میں چمکی،

www.taemeernews.com

پھر اس نے وہ آنکڑے واشگاف بچہ دانی میں ڈال دیے۔ چمکتی ہوئی دھات قبولیت پذیر اعضاء کی پیچ در پیچ اندرونی ساخت میں اتر کر بچے کو کھوجنے لگی۔ عورت نے دستے میں لگا ہوا پیچ گھمایا اور وہ بچے کے سر کے گرد کس گئے۔ وہ اسے باہر گھسیٹنے لگی۔ وہ عورت میز کے سامنے جھک گئی اور گھٹنے ٹیک کر زور لگانے، باہر کھینچنے لگی۔ اوزار کی گرفت میں آیا ہوا بچہ یوں باہر پھسلنے لگا جیسے وہ بھدا بے ہنگم جسم بچہ اگل رہا ہو۔۔۔۔ لال گلگلا سا لوتھڑا جس پر تمام سفید کھریا سی خشک رطوبت ملی ہوئی تھی اور مسخ شدہ۔ ریشے دار رسی کی طرح بٹی ہوئی آنول نال فراموش کردہ دم کی طرح ساتھ ساتھ گھسٹتی چلی آرہی تھی۔ اور جوں جوں بچہ پھسلتا باہر نکلتا چلا آرہا تھا اس کا سر اوپر اٹھتا آرہا تھا۔ جیسے وہ دنیا کا سامنا کرنے آرہا ہے، اپنی آمد کا، اپنے نوآفریدہ وجود کی بازیافت کا اعلان کرنے والا ہے.... مگر وہ خاموش تھا اور بے نور۔ اس کا منہ اور سر کچے پکے ہوئے دردوڑے کا سا تھا اور پلپلے سر کی ہڈی کھوپڑی پر سے اڑی ہوئی تھی۔ اس کے قبل از پیدائش بوڑھے چہرے کے ادھ بنے اعضاء اتنے مسخ تھے کہ میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ (کٹھ پتلی کی طرح، جو کہ میں تھی، اس وقت بھی اور ہمیشہ) اور لپک کر اسے اٹھا لیا۔ اچانک میری سمجھ میں آگیا کہ اس آسیب کے ساتھ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ دھات کے آنکڑے ایک لمحے کے لیے میرے ہاتھوں میں چمکے اور وہ آب بستہ ادھورا چہرہ تن سے جدا ہو گیا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور دنیا کے سامنے کر دیا کہ جو اسے دیکھے پتھر کا ہو جائے۔

مجھے نہیں معلوم کہ دنیا کے ساتھ کیا ہوا لیکن میں نے اپنے لہو بہاتے، سرد پڑتے بدن کی طرف دیکھا تو جانا کہ دنیا کے پتھرانے والوں میں، میں ہی پہلی تھی، اور میں ہی آخری۔

۱۹۸۶

ooooo

www.taemeernews.com

کاغذِ آتش دیدہ

www.taemeernews.com

*

جس رات اس نے پہلی مرتبہ کہانی سنی تھی، اسی رات وہ پہلی بار نیند میں اٹھ کر چلا تھا۔ معلوم نہیں کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعلق بھی تھا، لیکن یہ دونوں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ جو واقعات ایک ساتھ ہوتے ہیں، وہ مجھے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے جس رات وہ پہلی مرتبہ نیند میں اٹھ کر چلا تھا، اس رات اس نے پہلی بار یہ کہانی سنی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے اس کی نیندیں گہری ہوتی تھیں اور بے تکان۔ وہ غافل سوتا تھا اور سوتے میں اٹھتا نہیں تھا۔ یا شاید اس کے خواب توجہ طلب ہوتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے خواب دیکھتا تھا۔ اور دیکھتا بھی تھا کہ نہیں۔ لیکن یہ تو سب ہی نے دیکھا تھا کہ نیند کا غلبہ اس پر کتنی جلدی طاری ہو جاتا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد وہ جماہیاں لینے لگتا اور جماہیوں پر جماہیاں لیے جاتا۔ ذرا رات بھیگی اور وہ نیند میں جھومنے لگا۔ بات کرتے کرتے ایک لمحے کو چپ ہوا، آنکھیں مند گئیں، اندھیرا گھوم گیا، سر جھکنے لگا..... پھر چونکا، آنکھ کھلی، کچھ ہوشیار ہوا، پھر نیند کا ایک اور جھونکا۔ لیکن یہ کہانی اس نے نیند میں جھومے بغیر سنی تھی۔ (شاید اسی وجہ سے وہ ہوا جو ہوا تھا)۔ یا شاید وہ نیند میں تھا، کسی کو معلوم ہوئے بغیر، اور سونے جاگنے کی کسی ایسی درمیانی خمار آلود کیفیت میں کہانی سن رہا تھا جب سارا بدن سننے لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پلک تک نہیں جھپک رہی تھی۔

"تب اس نے کیا کام کرا، سرہانے کی چھڑی پائینتیا نے اور پائنتیا نے کی چھڑی سرہانے رکھ دی۔ چھڑیوں کا ادل بدل ہو کر پلنگ کی سفید چادر سے چھونا تھا کہ مدھم سی حرکت ہوئی اور ہلچل مچنے لگی۔ وہ خستہ تن جو سر کٹا ہوا، ہاتھ پاؤں الگ اور گردن سے خون بہتا ہوا بستر پر پڑا تھا، اس کے سب بکھرے ہوئے اعضاء جمع ہو گئے اور وہ یکجان ہو کر الااللہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا....."

یکایک کچھ ہوا۔ اس کے اندر بھی کچھ حرکت سی ہوئی۔ کھلی آنکھوں میں ایک جاگتا ہوا لمحہ کوند گیا۔ روشنی کا لہراتا ہوا چھلا سامنے سے ایک انکشاف بن کر گزر گیا۔ اچھا، تو یوں وہ آدمی پورا ہوا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی اس کے سبب اپنی نیندیں گم کر دے۔ سو وہ چپ چاپ اٹھا اور دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا حالاں کہ وہ اس وقت گہری نیند میں تھا۔

کسی کو کیا معلوم۔ اس کی خبر بھی یوں ہوئی کہ گھر کے لوگ رات گئے خالی، اندھیرے کمروں میں کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر چونکے۔ اس آہٹ کا پیچھا کیا گیا اور ایک سائے کو حرکت کرتا ہوا دیکھ کر وہ چوکنا ہو گئے اور اس کے پیچھے سے چپکے چپکے آ کر بتی جلائی گئی کہ روشنی کا حلقہ نمودار ہو اور اسے گرفتار کر لے تو پتہ چلا کہ یہ تو وہی تھا۔ مگر کیوں؟ وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ کیوں کہ وہ سو رہا تھا۔ کسی نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے ہڑبڑا کر

www.taemeernews.com

آنکھیں کھول دیں اور اتنی رات گئے سارے لوگوں کو بڑے کمرے میں جمع دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ خود کیسے آیا اور کیوں۔

اس سے اگلی رات لوگوں کو کم حیرت ہوئی تھی۔ مگر انہوں نے اس کو نیند میں چلنے سے روکنے کے بارے میں زیادہ سختی کے ساتھ سوچا۔

انہوں نے اس کو منع کیا۔ پھر دھمکیاں دیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سوتے سوتے اٹھ کر چلنے لگتا۔ دن کے وقت وہ ان سے وعدہ کر لیتا، اور رات کو جب وہ سو جاتے تو پھر بستر سے اٹھتا، دھیرے دھیرے قدم دھرتا ہوا، سحر میں مبتلا شخص کی طرح، اور دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھنے لگتا۔ وہ اپنی اس عادت پر قابو نہیں پا سکا۔ سوتے میں چلنے پر اپنی عادت پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ تب انہوں نے اسے روکنے کا فیصلہ کیا۔ دوسروں کے سوتے میں چلنے کی عادت پر قابو پانا آسان ہوتا ہے۔

پہلے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کا نام پکار دیتے تھے۔ اور اسے نام سے بلانا کافی تھا۔ کوئی اس کے بستر کے پاس جا کر بیٹھتا اور اس پر ظاہر کیے بغیر اس کی نگرانی کرتا رہتا۔ اس نے تکیے پر سر رکھا اور نیند سے جھوم گیا۔ کافی دیر بعد جب اس کی نیند گہری ہو چکی تھی تو وہ اٹھتا، کوئی آواز کیے بغیر، بہت دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا، جیسے اس کے ہاتھ، پاؤں سارا بدن دور سے آنے والے کسی جادو کے تحت آپ ہی آپ اٹھ رہے ہوں۔ دروازے پر آ کر وہ تھم جاتا اور اس کا ہاتھ کنڈی پر گھومنے لگتا۔ تب اس کی نگرانی کرنے والا اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا آتا اور زور سے اس کا نام پکار دیتا۔ نام پکارنے سے اس کا نیند ٹوٹ جاتی اور نیند کا جادو ختم ہو جاتا۔ وہ چونک کر جاگ اٹھتا، اور اپنے آپ کو نیند میں چلتا ہوا دیکھ کر جھینپ جاتا۔ نیند بھری آنکھوں میں خفت لیے ہوئے وہ بستر پر لوٹ جاتا۔ ایک بار اٹھنے کے بعد وہ اسی رات دوبارہ اٹھ کر نہیں چلتا تھا۔

لیکن نام بھی بار بار دھرائے جانے سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اور چونکا دینا چھوڑ دیتا ہے۔ اب وہ نام سنتا ہے اور چلتا رہتا ہے۔ جو لوگ نام سے پکارے جانے پر پلٹ کر نہیں دیکھتے، انہیں چھونا ضروری ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے اسے نیند میں چلنے کی اس حالت میں چھونا چاہا کہ اس کا کندھا ہلا کر جھنجھوڑ دے۔ لیکن اس کا سارا جسم برقی رو گزارے ہوئے آہنی ٹکڑے کی طرح جھنجھنا گیا اور اسے چھونے والا خود ہی لرز کر پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے اسے کسی نے پیچھے دھکیل دیا ہو۔ بجلی کی سی طاقت نے، جو نظر نہیں آتی، لیکن اثر رکھتی ہے۔ اور وہ چیخ پڑے۔ اتنے زور سے ..... اتنی وحشیانہ چیخ کہ اندھیرے میں دراڑیں پڑ گئیں۔ وہ صدمہ پہنچے ہوئے آدمی کی طرح کانپے جا رہا تھا۔ اسے موٹا کمبل اوڑھایا گیا کہ اس کی تھرتھری رک جائے۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

ان کی سمجھ میں آ گیا کہ اسے چھوا نہ جائے۔ لیکن اس کے نیند میں چلنے پر قابو پانا ضروری،

www.taemeernews.com

تھا۔ کسی نے باندھنے کی تجویز پیش کی۔

پرانے کپڑے کا پتلا سا ٹکڑا، جو کسی زمانے میں پہننے میں آتا ہوگا، اس کے سوجانے کے بعد پھاڑ کر اس کی کلائیوں سے باندھ دیا گیا۔ دوسرا سرا پلنگ پر تھا۔ لیکن اس نے اپنے بازو کھینچ لیے۔ اور اس رات بھی نیند میں چلا۔ حالاں کہ صبح کے وقت اس کی کلائیاں چھلی ہوئی تھیں۔ اور روز روز چھلنے وجہ سے جلد ہی ان پر کھرنڈ بن گئے۔ جن میں کھجلی ہوتی اور خون رستا تھا۔

اس کے بعد باری تو زنجیروں کی آنی چاہیے تھی، مگر کسی نے طشتری کا نام لے دیا۔ تو زنجیر کی نوبت نہیں آئی، ورنہ اکثر خوابوں کا انجام زنجیر ہی ثابت ہوتی ہے۔ وہ سوگیا تو اس کے دونوں پہلوؤں پر، پلنگ کی پٹی پر چینی کی دو طشتریاں رکھ دی گئیں۔ دونوں طرف اس لیے کہ اس وقت وہ لوگ فیصلہ نہیں کر پائے کہ نیند میں اٹھ کر چلنے سے پہلے وہ بائیں کروٹ سے اٹھتا ہے یا دائیں کروٹ سے۔ انہوں نے بہت دیر بحث کی، لیکن دائیں بائیں کی اس لاحاصل بحث کو بیچ میں چھوڑ کر انہوں نے دونوں طرف طشتریاں رکھ دیں۔ اور جب وہ اٹھا تو پہلو میں رکھی ہوئی طشتری چھن سے گر کر ٹوٹ گئی۔ اب کی بار وہ بہت شرمندہ ہوا کہ اس کی نیند کو روکنے کے لیے گھر کے برتن توڑنے پڑتے ہیں۔ لیکن نیند تو روز آتی ہے (نامعلوم کہاں سے) اور اتنی آتی ہے کہ اس کا اثر توڑنے کے لیے گھر کے برتن کم پڑ جاتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ گھر کی ساری طشتریاں ٹوٹ جائیں، ان میں سے ایک کو خیال آیا کہ ایک رات اسے چلنے دیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کہاں جاتا ہے، کرتا کیا ہے۔ اس نے اپنے اس خیال کو سب کے سامنے کہہ بھی دیا۔ وہ نیند میں اٹھ کر کیوں چلتا ہے اور اگر اسے روکا نہیں جائے تو آخر جائے گا کہاں۔ وہ اسے سوتے میں سے جگانے کی کوشش میں اتنے مگن تھے کہ انہوں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اب جوان میں سے ایک نے یہ سوال دہرایا تو ان کا تجسس بیدار ہوگیا۔

تب انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ آج کی رات جب یہ نیند میں چلنا شروع کرے تو اسے نیند سے نہ جگایا جائے۔ اسے چلنے دیا جائے اور انہوں نے یہی کیا اس رات۔ جس وقت وہ سونے کے لیے لیٹا تو سب دم سادھے اس کے بستر کے سرہانے پائینتیانے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور انتظار کر رہے تھے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، وہ چت لیٹا ہوا تھا اور ہلکے ہلکے خراٹے بھی لے رہا تھا۔ مگر وہ سوتا رہا اور ایسا لگا کہ آج سب اس کے نیند سے اٹھ کر چلنے کے منتظر ہیں وہ تو نہیں اٹھے گا۔ آج اس کی نیند بہت گہری تھی اور اسی گہری نیند سے وہ اٹھا۔ وہ دھیرے سے اٹھا، جیسے آہستہ روی کے ساتھ چلنے والی کسی پرانی فلم کا منظر۔ وہ آگے بڑھا تو اس کے بستر کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کا حلقہ بیچ میں سے ٹوٹ کر اس کے لیے راستہ بنانے لگا۔ وہ دوسرے کی طرف بڑھا۔ اس نے کنڈی پر ہاتھ رکھا۔ کنڈی سرکی، کواڑ کھل گئے۔ اگلے کمرے کا اندھیرا ایک ریلے کی طرح آیا اور اس کمرے کے اندھیرے سے مل کر ایک ہوگیا۔ وہ نیند میں چلتا

www.taemeernews.com

ہوا آیا اور لکھنے کی میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں ایک سناٹا تھا کہ سوتے ہوئے آدمی کا ایک ایک سانس سنائی دے رہا تھا کہ وہ میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ وہاں اندھیرے میں کیوں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہی کرتا تھا۔ میز پر کاغذوں کا دستہ اور قلم رکھا ہوا تھا۔ رات گئے وہ چلتا ہوا آتا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتا۔ وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا اور وہ کاغذ سامنے رکھ کر میز پر جھک جاتا۔ وہ اندھیرے میں کیسے لکھتا تھا، کیوں کہ لکھنا ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے تھوڑی بہت روشنی بہرحال ضروری ہے۔ لیکن وہ رات کے اندھیرے میں لکھنے بیٹھ جاتا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ سفید کاغذ کی ہلکی سی چمک اس کے لیے کافی ہے۔ لیکن شاید ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اندھیرے میں لکھنے سے اس کے لکھے ہوئے پر بھی فرق پڑتا ہوگا۔ حروف ایک دوسرے پر چڑھ جاتے ہوں گے، الفاظ الٹے سیدھے بن جاتے ہوں گے یا لکھنے سے چھوٹ جاتے ہوں گے یا عبارت کی سطریں ٹیڑھی ہو جاتی ہوں گی۔ لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز وہ آدمی گھپ اندھیرے میں بیٹھ کر سفید کاغذ پر لکھے جا رہا ہوگا۔ یا شاید ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو اندھیرے میں دیکھنے کا عادی بنا لیا ہوگا یا اتنی مشق کر لی ہوگی کہ اندھیرے میں لکھتا رہے اور عبارت کی درستگی بھی قائم رہے۔ یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ آدمی اندھیرے میں لکھنا بھی سیکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے اندھیرے کی ضرورت ہوتی ہے اور تھوڑے سے کاغذ کی۔ کاغذ جو اب وہ جلانے لگا تھا۔ اس کی اب یہ عادت ہو گئی تھی کہ وہ کاغذ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اتنا سا ٹکڑا بھی دیکھتا تو اٹھا لیتا، دیا سلائی رگڑ کر جلاتا اور کاغذ پر رکھ دیتا۔ (وہ ہمیشہ ایسی دیا سلائی رکھتا تھا جسے کسی بھی چیز سے رگڑ کر جلایا جا سکتا ہے)۔ ایک لمحے کے لیے گندھک کی تیز بو پھیلتی، کاغذ کو جہاں سے تیلی نے چھوا تھا ایک سیاہ داغ بننا شروع ہوتا اور ایک نیلگوں، نارنجی شعلہ لو دینے لگتا۔ ذرا سی دیر میں کاغذ کا وہ ٹکڑا چرمرا کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا۔ جلے ہوئے کاغذ کے سیاہ ٹکڑے ہوا میں اڑنے لگتے جو چھونے پر نرم معلوم ہوتے۔ وہ جلتے ہوئے کاغذ کے سامنے بیٹھا رہتا اور اس کا چہرہ دھوئیں میں تحلیل ہو جاتا۔

رات گئے اندھیرے میں ایک دروازہ کھلتا ہے اور اس دروازے سے گذر کر وہ جاتا ہے۔ اس وقت اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اندھیرے کی وجہ سے۔ اور رات میں ڈوبے ہوئے گھر کی خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ تھم جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر گیا ہے، وہ رک گیا ہے، وہ بیٹھ گیا ہے۔ وہ قلم اٹھائے گا اور میز کے اس کم اندھیرے حصے پر لے آئے گا جو کاغذ کی سفیدی ہے۔ اب وہ اندھیرے میں لکھے گا۔ میز کا وہ کم اندھیرا حصہ، جو اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کاغذ کی سفیدی ہے، اور زیادہ اندھیرا ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس نے کاغذ پر لفظ لکھ دیے ہوں گے۔ اور کاغذ سیاہ لفظوں سے بھر گیا ہوگا۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس لیے کہ ان لفظوں کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ انہیں وہ خود بھی نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن اسے شاید اپنی اس صلاحیت پر فخر ہے

www.taemeernews.com

کہ وہ اندھیرے میں لکھ سکتا ہے۔ اور رات گئے یہی کرتا ہے۔ اب وہ بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ کاغذ کی سمت بڑھا۔ ایک شعلہ سا اٹھا اور اندھیرے میں دھوئیں کی لکیر بل کھانے لگی۔ اس کے ہاتھ میں قلم نہیں دیاسلائی ہے۔ گھپ اندھیرے کمرے میں دیاسلائی کے رگڑ کھانے کی واضح آواز اور ایک شعلہ لہراتا ہے۔ اس شعلے کا مرکز سیاہ ہے، اوپر نارنجی، اس کے اوپر نیلا۔ شعلے کا نیلگوں حصہ تیز ہوا میں اڑنے والی تتلی کے پنکھ کی طرح کانپتا ہے اور جھلا کر بجھ جاتا ہے۔ پھر وہی اندھیرا۔ خاموشی۔ اس تمام مدت وہ وہیں موجود رہے گا۔ مدھم سانس لیتا ہوا، کرسی میں دھنسا ہوا، اندھیرے میں گم ایک نیم محسوس وجود۔ بے آواز۔ ایک منٹ۔ پانچ منٹ۔ پھر وہی رگڑ کی آواز، دیاسلائی کے سرے پر تھرتھراتا ہوا نارنجی پھول، اندھیرے کے سینے میں اگنے لگا۔ وہ وہاں کانپے گا اور اس کی تھرتھراتی ہوئی پنکھڑیاں جھڑ کر اندھیرے میں گم ہوجائیں گی۔ پھر اندھیرا چھا جائے گا۔ اور اس اندھیرے میں کسی وقت وہ پھر ایک دیاسلائی جلائے گا۔ رات کے پچھلے پہر وہ دیاسلائیاں سلگاتا رہے گا اور اندھیرے میں ننھے ننھے شعلے جلاتا رہے گا جو دیر گھنے اندھیرے میں ایک لمحے کے لیے چمکیں گے اور بجھ جائیں گے۔ وہ ایسا کرتا ہے، حالاں کہ ایسا کرنے سے نہ رات کے اندھیرے کم ہوتے ہیں نہ روشنی مستحکم رہتی ہے۔ وہ رات گئے سوتے سے اٹھ کر اندھیرے کمروں میں دیاسلائی جلاتا ہے۔

روشنی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ جلتا ہو۔ اور جلتا ہوا نہیں ہو تو اسے جلانا ضروری ہے۔ سفید کاغذ کو دیکھ کر میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے جیسے گھاس کا سوکھا جنگل دیکھ کر آگ لگانے کے جنونی کے دل میں، اور میں دیوانہ وار اسی کو چھونے، اس کے بے داغ اجلے پن سے اپنے آپ کو مس کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہوں۔ لیکن اسے ایسا مت کرنے دو۔ ٹھہرو، یہ کاغذ ہے اور کاغذ کے ساتھ یہ سلوک ہرگز روا نہیں۔ کاغذ کو جلانا نہیں چاہیے اور کاغذ کو بے کار سمجھ کر پھینک نہیں دینا چاہیے۔ اسے پیروں تلے مت آنے دو۔ زمین پر گرا ہوا دیکھو تو اسے طاقچے میں رکھ دو کہ یہ جگہ صاف اور اونچی ہے کہ کاغذ پر اسم اور آیت اور نقش بنائے جاتے ہیں اور تم اسے جلاتے ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ تمھارے ہاتھ نہیں کانپتے جب تم دیاسلائی کو کسی بھی چیز سے رگڑ کر جلاتے ہو اور تیلی کا مصالحے والا گول سرا کاغذ سے مس کر دیتے ہو اور میں لرز اٹھتا ہوں جیسے وہ گرم جلتی ہوئی تیلی مجھے جھلس رہی ہو۔ اور اس تپش سے میرا تن بدن یوں سمٹنے سکڑنے لگتا ہے جیسے آگ پر رکھا ہوا کاغذ جلتا ہے تو سمٹنے، سکڑنے، چرمرانے، اور راکھ بننے لگتا ہے۔ اس نے کاغذ کو دیاسلائی دکھائی اور میرا بدن جلا۔ تب انکشاف کا وہ چمکتا ہوا شعلہ ایک بار پھر میرے سامنے کوندا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی تمام تفصیل زندہ ہو کر کڑیوں میں جڑ گئی جیسے کسی غیر شخص کا افسانہ، وہی افسانہ اور وہی لمحہ جو کہانی سنتے وقت جھلملایا تھا اور جس کی دید و دریافت کی قیمت نہ جانے کتنی نیندوں کے بعد بھی میں پوری ادا نہیں کر پایا.....

www.taemeernews.com

جیسے چھڑی کے چھوتے ہی وہ کہانی کا کٹے پھٹے اعضاء والا آدمی پورا ہو کر اٹھ بیٹھا تھا، تو کہیں بھی کوئی بھی قلم کاغذ سے آکر مس ہوتا ہے تو میں یک جان ہو کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ یہ میرے جی اٹھنے کا منتر ہے۔ اور جتنی دیر قلم کاغذ پر حرکت کرتا رہتا ہے میں ثابت و سالم رہتا ہوں، اور جوں ہی کاغذ سے قلم جدا ہوتا ہے، میں نڈھال ہو کر گر پڑتا ہوں، میرا بند بند الگ ہو جاتا ہے۔ لب نہ یہ ہاتھ پاؤں میرے ہیں نہ یہ میری آنکھیں نہ میرا چہرہ۔ اگر کچھ میرا ہے تو یہ نیند کی رفتار اور اس جلتے ہوئے کاغذ کی جان کنی۔

۱۹۸۶

ooooo

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

زرخیز

www.taemeernews.com

*

یہ بلّی کی اپنی زندگی تھی۔ جیسی ایک بلّی کی ہوتی ہے۔ اپنی اس بلّیوں جیسی زندگی میں بلّیوں کی طرح جو اس کا جی چاہے کرے، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مجھے فکر تھی تو اتنی کہ بعد میں مشکل بچّوں کی ہوتی تھی۔ آخر ان کا بھی تو کچھ کرنا تھا۔

یہ بچّے بھی ہر دفعہ ہو جاتے تھے۔ پہلے میں انہیں دوسرے گھروں کو دے دیتی تھی۔ لیکن ان کی جگہ اور آجاتے، اور بانٹنے سے بھی بلّیاں کم نہیں ہوتیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ہمارے دوستوں، رشتہ داروں سبھی کے گھر میں بلّیاں ہو گئیں اور یہ سب بلّیاں ہماری دی ہوئی تھیں۔ پھر بھی ہمارے پاس اپنی خواہش سے زیادہ بلّیاں تھیں۔ لوگ ہمارے گھر آتے ہوئے کترانے لگے کہ کہیں ہم انہیں چلتے چلتے ایک بلّی اور نہ دے دیں۔ لوگوں نے پہلے انہیں پالتو جانوروں کی طرح قبول کیا، پھر اس لیے لے لیا کہ ہم اصرار کر رہے تھے اور اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ ہم ان سے ملاقات کے بعد رخصت ہو رہے ہوتے تو میزوں اور مسہریوں کے نیچے جھانکنے لگتے کہ کہیں ہم کوئی بلّی تو نہیں چھوڑے جا رہے ہیں۔ انہیں اور بلّیاں نہیں چاہیے تھیں اور ہمارے لیے بلّیوں کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کو اپنے گھر میں رکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم بلّیوں کے لیے نئے گھر تلاش نہیں کرتے تو اور کیا کرتے؟ مگر میں کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ نہ لوگوں کو نہ بلّیوں کو۔ میں پوری احتیاط کرتی تھی کہ ہماری بلّیاں ایسے گھروں میں نہ جائیں جہاں لوگ ان سے پیار نہ کریں، ان کی ضرورت محسوس نہ کریں، اور بلّیاں اس گھر کی چیزوں اور لوگوں میں بس نہ سکیں۔ بلّی پالنا کوئی شادی تو ہے نہیں کہ مارے باندھے کا سودا کر لیا۔ تعلق جوڑنا پڑتا ہے۔

لیکن اب میں پریشان ہو گئی تھی۔ جتنی بلّیاں تقسیم ہوتیں، کچھ عرصے بعد اتنی ہی اور ہو جاتیں۔ میرے پاس ضرورت سے زیادہ بلّیاں تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا کیا کروں۔

ابتداء میں ہم نے ان بچّوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ میں اس بلّی سے مانوس تھی، اور جو کچھ وہ کرتی تھی مجھے اس سے محبت تھی۔ پیدائش کے وقت اس کی تکلیف دیکھ کر میرے گالوں پر آنسو بہنے لگے تھے اور جب بچّے پیدا ہو گئے تھے تو میں نے فخر اور خوشی محسوس کی تھی۔ ان نوزائیدہ سفید گلابی ننھے منے کھلونوں کو اٹھا کر سارے گھر میں پھرتی رہی تھی۔ بلّی بے چین ہو کر میرے پیچھے پکارتی ہوئی چلی آئی تو نے ہنس کر اسی سے کہا کہ پگلی میں تیرے بچّوں کو چھین تھوڑی رہی ہوں، اور انہیں احتیاط سے واپس رکھ دیا۔ بلّی نے میری طرف دیکھ کر میاؤں کیا جیسے کہہ رہی ہو شکریہ، اور انہیں چاٹنے لگی۔ نابینا اور بے حد کم زور بچّے، کوں کوں کر

www.taemeernews.com

کے اس کے تھنوں میں منہ دینے لگے۔ بلّی انہیں دودھ پلاتی رہی تو میں حیرت اور مسرت کے ساتھ کھڑی دیکھتی رہی تھی۔ اس کی خوشی سے میں خوش تھی۔ اب وہ سب باتوں کو بھول جائے تو یہ اس کی مرضی۔ بلکہ میں تو اپنے معمول کے برخلاف، اس کی خورک کا زیادہ خیال رکھتی تھی اور نگرانی کرتی رہتی تھی کہ بچوں کی بو سونگھ کر وہ بلّا انہیں پھاڑ کھانے کے لیے نہ آجائے جوان کا باپ تھا (مجھے پرواہ نہیں تھی کہ محلے بھر میں گھومنے والے جنگلی بلّوں میں سے وہ کون سا بلّا تھا۔ مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مشترکہ دشمن ہے۔) بلّی اور میں، ہم دونوں ان بچّوں کو بڑھتے ہوئے دیکھتے رہے۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ نئی نئی آنکھوں کی شوخ معصوم حیرت اور نرم نکیلے پنجوں میں چھپی کھوج کے ساتھ انہوں نے اس گھر کے کونے کونے کو دریافت کرنا شروع کیا جوان کی پوری دنیا تھی۔ وہ گدوں پر چھلانگ لگاتے، قالین پر لوٹ جاتے، پیروں میں الجھتے، جھاڑیوں میں پھنس جاتے، ایک دوسرے سے کھیلتے۔ بلّی ان کو باری باری گردن سے پکڑ کر اور منہ میں دبا کر ایک کونے سے دوسرے کونے تک لے جاتی، اور وہ روئی کی نرم گیندوں کی طرح سارے گھر میں لڑھکتے ہوئے بلّی کے پیٹ کے نچلے حصے میں منہ چھپا لیتے۔ جلد ہی ان کی آنکھیں چمکنے لگیں، نرم خرخراہٹ میں کرارا پن آگیا، کھال روئیں سے بھر گئی۔ اب وہ بلّی کے پیچھے پیچھے نہیں پھرتے تھے۔ خود ہی کونوں میں گھستے، کیا کیا کچھ ڈھونڈتے پھرتے۔ بلّی دھوپ میں لیٹی، صلح کن بے زاری کے ساتھ انہیں دیکھتی رہتی۔ اور کبھی کبھار تنبیہہ کے طور پر ہلکی سی میاؤں کر دیتی۔ پھر اس نے وہ بھی کرنا چھوڑ دیا۔ بے زاری کی جگہ جھلاہٹ نے لے لی۔ شام کے وقت میں بلّی کے لیے رکابی میں دودھ ملائی رکھتی اور یہ ادھر کا رخ کرتے تو بلّی انہیں دیکھ کر غرانے لگتی۔ بلّی نے انہیں اپنے آپ سے الگ کر لیا تھا۔ لیکن میرے لیے انہیں گھر سے الگ کرنا مشکل ہو گیا اور یہ تو بچّوں کا پہلا ہی جھول تھا۔

لوگوں نے پھر مجھ سے کہنا شروع کیا کہ ان کو کہیں چھڑوا دیا جائے۔ (ایمپریس مارکیٹ میں جہاں قصائیوں کی دکانیں ہیں، وہاں بہت سی بلّیاں پھرتی رہتی ہیں، مجھے بتایا گیا تھا)۔ یہ سوچ کر میرا دل بہت دکھا۔ ان کے لیے میں نے ریشمی گدا سیا تھا، اس پر لیٹے ہوئے کتنے پیارے لگتے تھے۔ (تم ان سے ایسے لاڈ کر رہی ہو جیسے کسی عزیز سہیلی کی پہلوٹی کی اولاد، مجھ پر الزام لگایا گیا تھا۔ وہی لوگ اب میرے اس اقدام کو سفاکی کہیں گے)۔ یہ کہیں میدانوں، جھاڑیوں میں بھٹکتے پھریں گے، خون خوار کتے ان پر بھونکیں گے، اور آتے جاتے لوگ دھتکاریں گے۔ گلیوں میں اپنے خوراک تلاش کرتے کرتے، زندہ رہنے کے لیے درندگی سیکھتے ہوئے یہ جغادری بلّے بن جائیں گے جو چھتوں پر بیٹھنے والے اکیلے دکیلے کبوتروں کو تاکیں گے اور آنکھ بچا کر ادھر ادھر رکھی ہوئی چیزیں چھین لیں گے۔ میں ان کو ایسے انجام کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور میں انہیں اپنے گھر میں بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔

www.taemeernews.com

اگلی بار اس نے بچے دیے تو وہ میرے لیے شوق کا سامان بننے کے بجائے مصیبت معلوم ہونے لگے۔

پھر کسی نے مجھے بتایا کہ انگریز لوگ کیا کرتے ہیں بلّی کے ان بچوں کے ساتھ جن کو وہ رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ انہیں پانی میں ڈبکی دے دیتے ہیں۔ میں نے انہیں گرم پانی کے تسلے میں ڈال دیا۔ (گرم پانی سے انہیں تکلیف کم ہوتی ہے، مجھے بتایا گیا تھا۔) بچے بہت چھوٹے تھے، بے بس اور غیر محفوظ۔ ان کا اس دنیا میں پہلا دن بھی پورا نہیں ہوا تھا جہاں کوئی انہیں قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے انہیں بلّی کے پاس سے اٹھالیا اور ایک ایک کر کے پانی میں ڈال دیا۔ ان کی وجہ سے پانی کی سطح پر ارتعاش بھی تھوڑا سا ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ پانی میں پڑنے والا بھنور تھا کہ ان بچوں کی آخری کشمکش۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ پانی کی سطح پر اٹھنے والے بلبلے تھے یا میری آنکھوں میں کھٹکتے ہوئے آنسو۔ میں نے جب آنکھیں صاف کر کے دیکھا تو پانی کی سطح پر سکون تھی اور اس کی تہہ میں وہ یوں نظر آ رہے تھے جیسے تالابوں کی تہہ میں رہنے والے پتھر۔ میں نے انہیں اٹھالیا، ایک لمحے کے لیے سوچا کہ یہ تو ویسے ہی ہیں جیسے ابھی ذرا دیر پہلے تھے، اور اس سے پہلے کہ تسلے کا پانی میری آنکھوں سے چھلکنے لگتا انہیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ جب تک کوڑا اٹھانے والی گاڑی انہیں لے نہیں گئی، وہ وہیں پڑے رہے، کسی بچے کے توڑے ہوئے بے جان کھلونوں جیسے، جن پر مکھیاں بیٹھنے لگی ہوں۔

بلّی بے قرار ہو گئی تھی۔ وہ جب میرے سامنے سے گزرتی، میں گھبرا کر نگاہیں جھکا لیتی اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگتی جو بہت زیادہ بھیگنے سے نیلے معلوم ہونے لگے تھے۔ میں نے ان پر ہلکے سے پھونکا، اور ان یخ بستہ سن ہاتھوں میں خون کے رنگ کو واپس آتے ہوئے محسوس کیا۔ بلّی اپنے بچوں کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ کسی بے چین، بھٹکی ہوئی آتما کی طرح سارے گھر میں گھوم رہی تھی۔ گلی سے گھومتی ہوئی آتی، کمروں میں ڈھونڈتی، پکارتی ہوئی کھڑکی سے کود کر کیاریوں میں تلاش کرنے لگتی۔ اس کے لیے جو دودھ رکھا گیا، اس کو بھی منہ نہیں لگایا۔ رات کو اس کے پکارنے کی آواز ایسی لگ رہی تھی کہ کوئی بوڑھی عورت وقفے وقفے سے بین کر رہی ہو۔ ("یہ مامتا کی آگ ہے"، وہ لوگ اس کو نام بھی دے سکتے تھے)۔

بلّی کے دکھ میں میرا دل بھی بھر آیا تھا۔ مجھے کونے میں منہ دے کر آنچل سے آنکھیں پونچھتے دیکھ کر کوئی ہنسا تھا۔ "چند دن کی بات ہے۔ لوٹ پیٹ کر ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہاری بلّی سدا سہاگن ہے"۔ یہ سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنا تھوک نگلا۔ اب میری آنکھوں میں ملامت تھی۔ بلّی کے لیے دکھ بھری ملامت۔

میں نے خود دیکھا کہ وہ تھوڑے دن سے زیادہ ان بچوں کا سوگ نہیں مناتی تھی۔ یا گلی کے آوارہ بلے منانے نہیں دیتے تھے۔ ہنسنے والے لوگ ہنسا کریں، لیکن مجھے اس بات سے بہت

www.taemeernews.com

صدمہ پہنچا تھا کہ میری بلّی کا کردار ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے شروع ہی سے اسے بلّوں سے بچا کر رکھنا چاہا تھا۔ جس وقت وہ مجھے تحفے میں دی گئی تھی، مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ بلّی غیر معمولی ہے کیوں کہ یہ بلّیوں کی ایک نادر نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ایک ایک بچہ اتنے روپوں میں بکتا ہے اور قدردان ان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے اسی نسل کے بلے سے باقاعدہ میل کروایا جاتا ہے۔ یہ بلّی بہت نگہداشت مانگتی ہے۔ (تو کیا یہ اسی لیے مجھے دی گئی تھی؟ تاکہ میرا دھیان بٹا رہے؟)۔ اسے اِدھر اُدھر نہ پھرنے دینا۔ گلیوں کے آوارہ بلّے اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں اور اگر نقصان نہ بھی پہنچائیں تو دوغلے بچوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

اپنی بلّی کو میں نے بہت پابندیوں میں رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے مزاج کے مطابق تربیت دے لی ہے۔ وہ باورچی خانے میں رکھے ہوئے برتنوں میں منہ نہیں ڈالتی تھی اور بستر، قالین خراب نہیں کرتی تھی۔ پھر اس نے راتوں کو غائب ہونا شروع کر دیا تھا۔ دودھ کی رکابی چاٹ جانے کے بعد وہ گھر میں نظر نہیں آتی تھی۔ رات گئے باغ کی جھاڑیوں میں سے اس کے اور دوسری بلّیوں کے بولنے، ایک دوسرے سے لڑنے کی آوازیں آتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ایک انسان کی مسلسل رفاقت بلّی کے لیے اچھی نہیں ہے، اسے اپنے ہم جنسوں میں بھی کھیلنا چاہیے۔ میں نے اسے باہر جانے سے نہیں روکا۔ کئی بار میں نے اسے دیکھا ایک اور بلّی کے سامنے کھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر اور دم تان کر دعوت مبارزت دیتے ہوئے۔ باری باری غراتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکتے اور جھاڑیوں میں غائب ہوجاتے۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ کھیلنے والوں میں سے ایک کو گھر لے آئی۔ اس کا قد اس بلّی سے کہیں بڑا تھا۔ اس کا رنگ زیادہ دیر تک رکھی رہنے والی چائے کے اوپر جمی ہوئے پپڑی جیسا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دوستی نہیں تھی۔ خشونت تھی۔ میں نے اسے ہنکا کر بھگا دینا چاہا۔ میرے دھمکی آمیز انداز کے باوجود اس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔ اس کی دم چابک کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس نے غرانے کے لیے منہ کھولا جس میں اس کے نکیلے، تیز دانت جھلک رہے تھے۔ میں خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے پسپا ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے بھی واپسی کا ارادہ کیا۔ اور جب اس نے پیچھے مڑ کر باہر کا رخ کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی تنی ہوئی دم کے نیچے پکے ہوئے اخروٹوں کی طرح دو خصیے لٹکے ہوئے تھے۔

میں اپنی بلّی کو اس قسم کے کھیل کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن اب اس نے باہر کا راستہ دیکھ لیا تھا اور میرے چمکارنے سے رکنے والی نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ کو باور کرالیا ہوگا کہ اس کو بھی وہی کرنے دو جو اور بلّیاں کرتی ہیں۔ اس کے باوجود میں رات کو سونے سے پہلے تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے باہر جانے کے سارے راستے روک دیتی تھی۔ پھر

www.taemeernews.com

بھی وہ نکل جاتی تھی۔ نہیں معلوم کیسے۔ آنکھ کھلتی تو صبح کے اخبار کے ساتھ دروازے پر موجود ہوتی۔ ریشمی کھال جگہ جگہ سے کٹی پھٹی، خراشوں کے نشان، پنجوں میں کیچڑ، مٹی بھری ہوئی۔ دروازے کھلتے ہی میاؤں میاؤں کیے جاتی، جیسے اپنی بے پناہ مسرت اور تسکین کا اظہار کر رہی ہو۔ وہ کسی خوش باش عورت کی طرح نظر آتی۔

یہی زمانہ ہوگا جب اس نے پہلی مرتبہ بچّے دیے تھے۔ میں نے انہیں بھی خوش ہو کر برداشت کیا تھا۔۔۔ میں نے یہ اس پر ظاہر کر دیا تھا۔۔۔ حالاں کہ وہ اپنے باپ پر گئے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس وجہ سے میں نے اس کے بچوں سے محبت میں کوئی کمی کی تھی۔ اور میں نے اپنے سامنے بھی اس سے پہلے اعتراف نہیں کیا کہ مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ مایوسی اور شرمندگی۔ اس سے پہلے کہ میں بھول پاتی، اس نے بچّوں کا ایک اور جھول دے ڈالا۔

اب یہ اس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ ہر مرتبہ اس کے بچّوں کی مشابہت مختلف ہوتی۔ کبھی چتکبری، کبھی دھاریدار۔ اور میرے لیے ان کو ایک اچھا گھر دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ کتنا مشکل، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن میں نے پھر بھی اسے سرزنش نہیں کی اور کرتی بھی تو وہ اسے کون سی اہمیت دینے کو تیار تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اب اس کی زندگی میں میرا حصہ بتدریج کم ہوتا جارہا ہے اور ان آوارہ، جنگلی بلّوں کا بڑھتا جارہا ہے جو بہت واضح طور پر اس کے عاشق تھے۔ بہت تھوڑے سے تھے وہ دن جب وہ میرے پاس رہتی تھی۔ میرے چمکارنے پر چلی آتی۔ میرے پیروں میں بیٹھ جاتی۔ اپنے وقتوں سے کھانا کھاتی اور ٹی وی کے سامنے نرم تکیے پر پڑی ستاتی رہتی (جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو)۔ اور بعض دنوں میں ایک عجیب وحشت اس پر سوار ہو جاتی۔ کئی کئی دن غائب رہتی۔ گھر واپس آتی تو جیسے کہیں سے مار کھا کر، بچ بچا کر آرہی ہو۔ میں اس کی خراشیں گرم پانی سے دھو کر ان پر مرہم لگانے بیٹھتی تو اس کا سارا بدن میرے ہاتھوں سے پھسلا پڑتا۔ اس کے گلے سے دھیمی آواز نکلتی اور وہ میرے ہاتھوں پر پنجے مارنے لگتی۔ وہ اپنے بدن کو چرا کر یوں پیچھے ہٹ جاتی جیسے میں اس کو سہلاتی ہوئی اس کے پیچھے آؤں گی اور وہ یوں ہی مستی میں آکر مجھ سے کھیلے گی۔ اس کے اندر بہت زیادہ سراہے جانے والی عورتوں کا نخریلا پن آگیا تھا۔ مجھے معلوم بھی نہیں ہو پاتا تھا، اور اس پر ایسے دنوں کی آمد کی خبر سارے بلوں کو ہو جاتی۔ وہ رات بھر میری کھڑکی کے نیچے روتے تھے۔ اور میں اندھیرے میں غائب ان روتی، پکارتی ہوئی آوازوں کی نحوست کے اثر سے جاگتی رہتی۔ کتنی ہی بار میں نے ان کو دیکھا۔ اپنی طلب کی بے قراری میں کھڑکی کی گگر پر چڑھتے ہوئے، اور اندر آنے کے راستے میں حائل پا کر جالی پر مایوسانہ پنجے مارتے ہوئے اور بد روحوں کی طرح منڈلاتے ہوئے۔ میں نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن وہ چپکے سے غائب ہو جاتی تھی۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھتی اور کمر کے چکر کاٹنے لگتی کہ کہیں سے ان آوازوں تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔ اس کے حلق سے بھی ویسی ہی جوابی آوازیں نکلنے

www.taemeernews.com

لگتیں۔ نہ معلوم کیسے اور کب وہ باہر پہنچ جاتی۔ پھر رات بھر مجھے بلّیوں کے دھم دھم کودنے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے اور گتھم گتھا ہونے کی آوازیں آئے جاتیں۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس کو بلے کے ساتھ پکڑوں اور ان آوازوں کا پیچھا کیا لیکن اس نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ وہ بہت چالاک تھی اور ایسے کام خفیہ طور پر کرتی تھی۔ باقی لوگوں کی تو پتہ ہی اس وقت چلتا تھا جب آوارہ اور ڈھیٹ بلے ہمارے گھر کے چکر کاٹنا چھوڑ دیتے اور اس کا پیٹ پھولنے لگتا۔

"تمہاری بلّی فاحشہ ہو گئی ہے۔" مجھے بتایا گیا۔ جیسے کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہے۔ مجھے اس الزام سے زیادہ اس لہجے میں موجود عدالت کی سی گھن گرج سے خوف آیا تھا۔ اس دن مجھے پتہ چل گیا کہ اس کی بلّیوں جیسی زندگی مجھ سے الگ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے گلاب کی قلم لاکر دی۔ میں نے ان سے نہیں پوچھا کہ کیوں۔ سوال میں نے اپنے آپ سے کیا کہ ہر بار مجھے نیا شغل کیوں لاکر دیا جاتا ہے جیسے یہ وش کا پیالہ ہو۔ میں اس سوال کو بھی پیالے کی طرح پی گئی اور پوری تندہی کے ساتھ گلاب کی اس قلم میں جٹ گئی۔ یہ میرے لیے خاص طور سے پنجاب سے منگوائی گئی تھی۔ مجھے اس کی بھی احتیاط کر کے دکھانی تھی کیونکہ مجھے سے اس کی توقع تھی۔ میں نے اس کے لیے تھالے بنوائے، کیاریوں میں کھرپی سے گڑائی کی، پانی دے کر زمین تیار کی، قلم کو مٹی میں اتارا اور اس سوکھی ٹہنی پر ہری پتی کے پھوٹنے کا انتظار کرتی رہی۔ ایک قلم جوں کی توں رہی، سوکھی ٹھنٹھ۔ دوسری پر بہت باریک سے پتے پھوٹے۔ میں نے انہیں بھی اگتے ہوئے، بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اسی لیے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان میں کوئی گڑبڑ ہے، یہ گلاب کی قلم صحیح طور سے ہری بھری کیوں نہیں ہوئی۔ میں نے اس بار حل خود تجویز نہیں کیا بلکہ اس کا علاج ہر ایک سے پوچھا۔ جس نے جو بتایا میں نے آزما کر دیکھا۔ کسی نے کہا کراچی کی مٹی ہی ایسی ہے کہ اس میں گلاب پنپ نہیں پاتا۔ میں نے کیاری کی مٹی بدلوادی۔ کسی نے کہا اس کی جڑ میں چائے کی پتی ڈالو میں نے وہ بھی ڈالی۔ لیکن پودا بڑھ کے نہ دیا۔ بیمار بچے کی طرح مرجھایا ہوا سا ہی رہا۔ اس میں پھول بھی لگا تو چھوٹا سا اور پھیکا سا۔

پھر کسی نے مجھے بتایا کہ انگریز لوگ کیا کرتے ہیں پودے کی برھوتری کے لیے۔ وہ ان سے باتیں کرتے ہیں۔ میری شکل پر کچھ زیادہ ہی بے اعتباری برس رہی ہو گی، کیونکہ مجھے بتایا گیا کہ پودوں میں بھی حس ہوتی ہے، وہ بھی جان دار ہوتے ہیں اور اگر کوئی ان سے رابطہ قائم کرنا چاہے تو اس کے جذبات کا جواب دیتے ہیں۔ میں نے پھر بڑی مشکل سے تھوک نگلا اور دل میں سوچا کہ کاش میں آکاس بیل کی سی نظر آنے والی، سچ مچ کی آکاس بیل ہوتی۔ اور کوئی مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہتا۔ تب میں خوب ہری بھری ہو جاتی اور کسی چوڑے تنے پر پھیل جاتی۔

افسوس کہ میں پودا بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں اپنی محرومی کی وجہ سے

www.taemeernews.com

گلاب کی اس قلم کو اگنے کا موقع ملنے سے کیوں روکوں۔ اس میں تو پھول آ جائے۔ میں نے اس سے باتیں کیں۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔

گلاب کے ٹھٹھرے ہوئے پتے ہوا میں ہلتے رہے تو میں سمجھی کہ وہ میری تائید کر رہے ہیں مجھ سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ بلّی کا افسوس کر رہے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں نے ایک بار پھر غلطی کر دی ہے۔ مجھے اس پودے کو اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ میں اپنی زندگی کو لمحہ لمحہ جینے کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ میں یہ فراموش کر بیٹھی کہ اس سے بھلا کوئی کیا بارآور ہو گا۔ جو اس کو سینے گا اسی کی طرح اجڑا ہوا رہ جائے گا۔ نہ پھول نہ پتے۔ بس سوکھے ڈنٹھل اور یہ نمو کی آرزو۔

سو میں نے غلط کیا کہ پودے سے رابطہ کیا تو اسے اپنا رازدار بنا لیا، کیوں کہ اس نے میری بات کا جواب یوں دیا کہ اس پر جو کلی کھلی وہ بہت چھوٹا سا پھول بنی۔ بیمار گلاب جو بڑھنے سے رہ گیا ہو۔

میں تو اس سے بھی خوش تھی کہ پھول کھلا تو سہی۔ میں نے جا کر اسے دیکھا تو ایک بار پھر صدمے سے دوچار ہوئی۔ اس میں کیڑا لگ چکا تھا۔

اور کیڑوں بھرے گلاب کا رنگ پھیکا تھا، پنکھڑیاں مرجھائی ہوئی اور ان پر موت کا اٹل نشان۔

یہ ایک ہی سلوک کا مستحق تھا۔ میں اندر ہی سے قینچی لے آئی اور جھجکے بغیر، چمکتی ہوئی دھات سے اسے کاٹ دیا۔ اسے بھی اور اس ننھی سے کلی کو بھی جو بہت پژمردگی کے ساتھ دوسری شاخ پر سر اٹھا رہی تھی۔

اس کلی کو کاٹتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے بلّی کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔

ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے نہایت منطقی انداز میں تمام دلیلیں اپنے سامنے پیش کیں، اور خود ہی سنیں۔ میں اس بلّی کو اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا یہ حل ناممکن تھا۔ میں بلّی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے، بغیر کسی روک ٹوک کے کرتی رہے۔

بچّوں کی یہ یلغار ختم ہونی چاہیے تو جو اس کے کوکھ سے یوں چلی آ رہی ہے جیسے بڑھیا کے تنور سے نکلنے والا سیلاب، جو ذرا سی دیر میں ساری دنیا کو بلّیوں سے بھر دے گا۔

اور مجھے اس کا یوں بچّے پیدا کیے چلے جانا اپنی توہین معلوم ہوا۔ جیسے وہ اپنی زرخیزی کے ذریعے مجھے چڑا رہی ہے۔ اپنی برتری جتا رہی ہے۔ سرکشی اور گستاخی کے ساتھ مجھ پر طنز کر رہی ہے۔ اس کی نافرمانی میری شکست ہے۔ اور اس شکست کا سبق میں اسے سکھا کر رہوں گی۔

بلّی کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس بار میرے چمکارنے میں اس کے لیے خطرہ ہے۔ وہ

www.taemeernews.com

اٹھلاتی ہوئی آئی، اپنا بدن مجھ سے رگڑنے لگی۔۔۔ رنڈی، میں نے اسے زیرلب گالی دی۔۔۔ اور خرخراتی ہوئی میرے بازوؤں میں کود آئی۔ اسے اسی وقت بھی اندازہ نہیں ہوا کہ میری یہ گرفت، رقابت کی آگ کے سبب مضبوط ہے۔ بلّی نے اس وقت بھی میرے بازوؤں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی جب میں نے اس کا سر گرم پانی کے تسلے میں ڈبو دیا۔ اور جب اس نے کوشش کی تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ زور سے پھڑکی اور چت لیٹ گئی۔ میں نے اس کو الٹا لٹایا اور اس کے چاروں پنجے پھیلا کر کناروں سے باندھ دیے (بالکل جراحی کے عمل کی اس فلم کی طرح جو وہ ان دنوں ٹیلی وژن پر تفریحی پروگرام کے طور پر دکھاتے ہیں) اور پھول کاٹنے کی اس چمکتی قینچی کا پھل اس کی کھال میں اتار دیا۔ اور چونکہ میں ٹیلی وژن کے پروگرام بہت باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ دیکھتی ہوں، اس لیے اس کی الجھی ہوئی انتڑیوں اور خون بہاتی ہوئی رگوں کے درمیان مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مشکل نہیں ہوئی کہ اس بےپناہ زرخیزی کا مجرم کون سا عضو ہے۔ میں نے اسے گلاب کی کلی کی طرح قینچی سے کاٹ لیا۔ قینچی کے پھل میں دبائے ہوئے میں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

تب مجھے لگا کہ خون امڈا چلا آتا ہے۔ بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔ سارا تسلا سرخ ہوا چلا جا رہا تھا۔ اور اس گدلے پانی میں گاڑھا گاڑھا خون تھا، تازہ خون۔ اس خون کی پھوٹتی ہوئی سرخ تازگی یکلخت میرے سینے میں برچھی کی طرح لگی اور ایک ناقابل تلافی نقصان کے احساس سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس خون کو رک جانا چاہیے۔

مجھے خیال آیا اب میں اس کو واپس کیسے لاؤں گی۔ میں نے ٹیلی وژن کے کسی پروگرام میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ کون سے عمل ہوتا ہے جس کے بعد جراحی کا مریض اپنے پیروں پر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اور اپنے ہاتھ بھی میں نے اسی تسلے میں ڈال دیے۔ ان نیلے پڑتے ہاتھوں سے میں نے بلّی کا بےحس بدن چھوا کہ شاید اس میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں تو وہ جواب دے۔ لیکن جہاں سے میں نے وہ زرخیز عضو کاٹا تھا، وہاں سے خون پھوٹے جا رہا تھا اور تب مجھے پتا چلا کہ میرے ہاتھ جان لینا جانتے ہیں جان دینا نہیں، اور اسی لیے میں زرخیزی سے محروم ہوں۔ دھرتی کے اس روپ کی طرح جس کی آنکھوں میں سیم اور بدن پر تھور بڑھتا جا رہا ہو۔

اب میری زندگی کی دھلیز پر کوئی بلّی دبے پاؤں آکر نہیں پوچھے گی۔۔۔ میں آؤں؟ وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔ اور اس کے نہ آنے کی پاداش میں مجھے ساری زندگی یوں ہی گزارنی پڑے گی اپنی بلّی کے بغیر۔

۱۹۸۶

ooooo

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

قُلزم

www.taemeernews.com

*

مجھے تو پہلے سے پتہ تھا کہ یہ ہو کر رہے گا۔ اس نے اپنے آپ کو سوچتے ہوئے پایا۔
اب اس میں شُبے کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس وقت تک پوری طرح ظاہر ہو چکا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ ہونے والی بات ان دونوں کے درمیان ایک ایسی موجودگی کی طرح قائم ہو چکی ہے جس کی علامت کو نہ جھٹلایا جا سکتا ہے نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ وہ اتنا تو سمجھ گیا کہ اس کو اتفاقات کا سلسلہ یا غیر متعلق حادثہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ سب اسی کی نشانیاں تھیں۔ یہ سب آپس میں مل کر ایک ہی تشخیص کر رہی تھیں کہ اب اس کا سامنا کرنا لازمی ہے۔ یہ اشارے جو کچھ بتا رہے تھے، اس کے ہونے کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ بھی تو ضروری تھا کہ اس کی بابت کوئی نہ کوئی جذباتی رد عمل سامنے آئے۔ فوری تاثر تو پشیمانی کا تھا۔ اگر اس کو روکا جا سکتا تھا تو پھر میں نے ایسا کیوں ہونے دیا؟ پچھتاوے کے سوالوں میں ملامت اور پھر ملال کا رنگ گھلتا گیا۔ ایسا کیوں ہونے دیا، کیوں؟ اگر میں اس سے آزاد اور مبرا ہوتا؟ اس خلش میں افسردگی کا عنصر بہت واضح تھا۔ جو کچھ ہوا ہے، اس پر دکھ۔ ایک دبا دبا سا احساس زیاں۔ کسی ان جانی مگر نایاب کیفیت سے محروم ہونا، ایک ایسی ابتدائی اور اساسی کیفیت سے بچھڑ جانا جو یقیناً زندگی کا ایک پورا دور تھی۔ جب اس پر ایسا ہو جانے کا واقعہ خبر بن کر پھٹ پڑا، تو اضطراری عمل کے طور پر اس نے اپنے آپ کو ایسے ہی جذبوں سے مغلوب ہوتے ہوئے پایا۔ اس شخص کی طرح جو ہر ناگہانی کا سرا اپنی پیش بینی سے جوڑ لیتا ہے، اور اس مشکل وقت میں اپنی بداندیشگی کو جتانا ضروری سمجھتا ہے۔ حالاں کہ یوں اسے نہ تسکین ملتی ہے نہ کوئی حل۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ انجام ہو کر رہے گا۔ اس وقت تو ذرا سی بے احتیاطی لگ رہی تھی، وہ اپنے آپ کو باور کرا رہا تھا۔ ایک زرد، کسیلا ذائقہ اس کی زبان سے پھسلتا ہوا اس کے حلق کو ادھیڑتا ہوا اس کے معدے میں اترتا جا رہا تھا۔ اس کا سارا منہ کڑواہٹ سے بھر گیا۔ اس نے اس کڑوے پن کو تھوک دینا چاہا۔ لیکن یہ ذائقہ زبان سے علیحدہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ اب یہ ساتھ رہنے کے لیے آیا ہے، اس نے پھر اپنے آپ سے کہا اور ایک سلگتا ہوا سناٹا اس کے سینے میں اترنے لگا۔
"تو یہ ہو ہی گیا، آخر کار۔ مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ ضرور ہو کر رہے گا۔ ایک نہ ایک دن ...."
اس نے کروٹ بدلے بغیر بستر کے دوسرے حصے کو دیکھا۔ وہ آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے لیٹی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بند نہیں تھیں، کیوں کہ وہ ذرا ذرا دیر بعد آنکھوں کے کونوں سے اس کی جانب دیکھتی تھی، جیسے وہ یہ جاننا چاہ رہی ہو کہ اس کی رد عمل کیا ہوا ہے۔ وہ بار بار اس کی طرف دزدیدہ نظر کرتی رہی۔ پھر اس سے صبر نہ ہو سکا، اور اس نے ایک ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان جھری بنا کر بے چینی کے ساتھ اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ اب اس کی نظریں

www.taemeernews.com

اس کے چہرے کا اس طرح جائزہ لے رہی تھیں۔ جیسے کوئی بہت عجلت میں کتاب پڑھ لینے کی خواہش میں ایک سطر کے بعد دوسری سطر چھوڑتا جارہا ہو۔ لیکن اس صفحے پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ یا اگر لکھا ہوا تھا تو وہ اس رسم الخط کو پڑھ نہیں سکتی تھی۔ وہ کروٹ بدلے بغیر لیٹی رہی۔ وہ بھی خاموش لیٹا رہا۔ دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ دونوں میں سے کسی نے جنبش بھی نہیں کی۔

ہمیشہ کی طرح پہل اس نے کی۔ ایک بہت ہلکی سی جُنبش کے ذریعہ، جس کے کرنے کے لیے اس کو تو کافی کوشش درکار تھی مگر دوسرا اسے پوری طرح محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر تھوک نگلا۔ وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے لیٹا تھا۔ مسہری کے پاس چھوٹی میز پر سگریٹ کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لے۔ کچھ اور نہیں تو سگریٹ ہی پی لے۔ شاید اس سے خاموشی کا یہ خلا پر ہو جائے۔ وہ ایسے موقعوں پر سگریٹ پیا کرتا تھا جب سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ یا وقت کے تسلسل میں ایسے بے تکے لمحوں کو دور کرنے کے لیے۔ کیا یہ بھی ان لمحوں میں سے ایک تھا، یا اس سے زیادہ کچھ اور؟ وہ فیصلہ نہیں کر پایا۔ اور سگریٹ پینے کا ارادہ جو پہلے ہی متزلزل تھا۔ اب اور مہمل معلوم ہونے لگا۔ اس کا ہاتھ آگے نہیں بڑھا۔ تکیے پر سرسراتے ہوئے ہاتھ کی حرکت اسے کراہ کی طرح معلوم ہوئی، گھٹی ہوئی ایک چیخ جو کمرے کے ساکت، بوجھل سناٹے کو توڑ ڈالے گی۔ اس کا ہاتھ جیسے وہیں پتھرا کر رہ گیا۔ وہ اس گاڑھے سناٹے میں ارتعاش نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس وحشت خیز سناٹے سے دم بھی تو گھٹا جارہا تھا، جیسے یہ کیس دلدل کی طرح انہیں چپ چاپ نگل لے گا۔ اس خاموشی کو جاری رہنے کی اجازت بھی تو نہیں دی جا سکتی۔ وہ دونوں جانتے تھے .... اور خاموشی کے ایک ایک لمحے کے ساتھ ان کا یہ جاننا بھی پختہ ہوتا جارہا تھا کہ دوسرا فریق بھی ان کے جاننے کو جان گیا ہے .... کہ خاموشی کا یہ لمحہ بھی ردعمل کی ایک شکل ہے۔ دو لوگوں کے درمیاں نمودار ہو جانے والی خاموشی، جو اپنے جاننے میں ایک دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے۔ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے ہیں۔ پھر انجانے پن کی یہ چپ گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹنے لگتی ہے۔ اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ یہ واقفیت مجرمانہ راز کی طرح بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ جیسے وہ بوجھ سینے کو دبا رہا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ بھاری پڑتا جارہا ہو، اور اگر دونوں میں سے کسی نے بول کر اس کو توڑ نہ دیا تو اس دباؤ کی وجہ سے پسلیوں کا یہ پنجرہ پھٹ پڑے گا اور دل لہولہو کر بہہ جائے گا۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی، جس کی موجودگی کا شعور تو پہلے سے تھا۔ اب اس خلیج کا نیلا پانی جم کر برفا گیا تھا۔ سمندر کے پانی کی جگہ نیلگوں برف جمی ہوئی تھی۔ جس کے دو مختلف کناروں پر کھڑے ہو کر وہ اپنی دوری کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ دوری کی نیلگوں برفاب، جس کی تہہ میں وہی بات۔

پھر اسی نے ہمت کی۔ (شاید اس میں جرأت سے زیادہ بزدلی کا پہلو ہوگا۔ اس سے اب

www.taemeernews.com

برداشت نہیں ہو رہا ہوگا۔ اس کا دم بالکل گھٹا جا رہا ہوگا۔ اس کا سانس اکھڑنے لگا ہوگا اور جس طرح ایسے مریض ہانپتے ہوئے کمروں سے باہر نکل کر کھلی ہوا کے لیے دیوانہ وار لپکتے ہیں، وہ جلدی سے بولا ہوگا)

وہ پہلے بولا۔ اس کی آواز میں جرأت اور بزدلی دونوں ملی جلی تھیں۔ جیسے وقت کے ایک خاص لمحے میں دن اور رات ملے جلے نظر آتے ہیں۔ اس کی اٹکتی ہوئی آواز میں ایک بے ہمت پسپائی تھی اور آخری داؤ پھینکنے والے کا انداز بھی۔ وہ آواز چاقوؤں کے پھل کی طرح اندھیرے میں کانپی، اور پھر بہت قطعیت کے ساتھ، جیسے اس نے اپنا نشانہ پالیا ہو، اس برفائی ہوئی خلیج میں اتر کر اس میں شگاف ڈالنے لگی کہ اب برف ٹوٹے گی اور اس کے اندر سے جما ہوا نیلا پانی بہے گا، لہو بن کر آزاد ہوگا۔ چاقو کے وار کی طرح اس نے فقرہ تول کر ادا کیا۔

"کیا تمہیں پورا یقین ہے؟"

اس سوال کے کرنے کے دوران ہی اسے احساس ہوگیا کہ اب اس سوال کا وقت نکل چکا ہے۔ پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔ محض اس خاموشی کو توڑنے کی خاطر۔ وہ یہ پوچھنے سے کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ یہ پوچھ کر وہ ماضی میں جانے اور اس واقعے کو ان ہونی میں تبدیل کر دینے سے تو رہا۔

جواب دھیمے مگر مضبوط لہجے میں ملا:

"ہاں"۔

جواب دو ٹوک تھا۔ اتنا واضح کہ اگلا سوال قطعاً غیر ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔ اسے سوال کے جواب سے زیادہ دل چسپی سکون کے اس حاوی ہوتے ہوئے احساس سے نجات حاصل کرنے سے تھی۔ اسی لیے اس نے سوال کا جواب آنے سے پہلے لمبا سانس بھرا، اور اپنے ذہن میں اس آواز کی چبھن محسوس کرنے لگا۔

"کیسے پتہ؟"

"پتہ چل ہی جاتا ہے"۔ اس نے جواب سنا لیکن یہ طے نہیں کر پایا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس مرحلے پر آکر ایک ایک جملہ اہم تھا، مفاہیم کی لرزشوں سے بھرا ہوا اور ننگی تلوار کی طرح سُنتا ہوا.... اور یہ جملہ، یہ کیا کہہ رہا تھا؟ کیا وہ صاف جواب دینے سے پہلو تہی کر رہی تھی؟ یا اس بات پر چڑ گئی تھی کہ پوچھ گچھ کرنے کے بجائے اسے خود بوجھ لینا چاہیئے تھا، اور اندازہ لگا کر خوش ہونا چاہیئے تھا۔ وہ سمجھ گئی ہوگی کہ یہ سوال اس آدمی کے نہیں ہیں جو خوشی سے بے قابو ہو جانے سے پہلے پورا یقین کر لینا چاہتا ہے۔ یہ اشتباہ اس شخص کا تھا جو یہ اندازہ لگا رہا ہے کہ اب بھی بچ نکلنے کے کیا امکانات ہیں۔ اور اسی آخری امکان کو ٹٹولنے کی خواہش ہی تو تھی جو اس سے سوالوں کے جواب کے لیے اصرار کروا رہی تھی۔

www.taemeernews.com

اس نے سوال دہرایا۔ اور اس کا بھی جواب سنا۔

اب کی بار جواب ناقابل تردید تھا۔ اتنا کھلا اور کھرا کہ ابہام کی اتنی سی رمق بھی نہیں رہ گئی۔ جواب میں گستاخی کے ساتھ جسمانی حقیقیت کا بے محابا اظہار اسے ننگی گالی کی طرح لگا۔ مگر اس گالی کو دعوت تو اس نے خود دی تھی۔ یہ گالی بھی اسے سننی ہی تھی۔

"پہلے کبھی اتنے دن اوپر نہیں ہوئے"۔

جواب میں تیزی تھی۔ اور تلخی بھی۔ اس نے یہ جملہ زہر کی طرح اگلا ہوگا۔ اس زہر کا جواب دینے کے لیے اس کے سارے بدن کا خون چہرے کی طرف دوڑنے لگا۔ لیکن اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ شرمندگی اور خفت کے مارے وہ اپنا تھوک بھی بڑی مشکل سے نگل پایا۔ اس کا حلق ایک بار پھر کڑواہٹ سے بھر گیا۔ تیزابیت کی ایک لہر حلق سے خراش ڈالتی ہوئی اس کے پیٹ کی طرف حرکت کرنے لگی۔ ایک سنسناہٹ کے ساتھ سارے بدن میں گرمی سی پھیل گئی۔ اور یک لخت سارا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔

وہ اسی طرح ساکت لیٹا رہا۔ اس تلوار کی دھار جیسے پل صراط پر ذرا سی بھی جنبش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اور وہ کرتا بھی کیا؟ اس وقت کیا کرنا چاہیئے جب کچھ کرنا ہو اور سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کرنا چاہیئے؟ اس نے بے دھیانی میں سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور پھر ہاتھ روک لیا۔ اس خیال سے کہ اب وہ سگریٹ پینے والا ہے، اسے خود ہی گھن آنے لگی۔ اور باقی ہر چیز سے بھی۔ سب کچھ کس قدر غلیظ تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے بستر کے دوسرے حصے کی طرف دیکھا۔ وہ نیلی چادر اوڑھے ہوئے جس طرح لیٹی تھی، ادھر بستر میں سلوٹیں پڑ گئیں تھیں، جو اس کے جسم سے مطابقت رکھتی تھیں۔ مسلی ہوئی، ملگجی لکیریں جو کہیں مدھم تھیں اور کہیں کہیں واضح اور خم دار، اس بوجھ کے حساب سے جو ان پر ڈالا گیا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ان لکیروں، سلوٹوں میں بھی ایک طرح کا کچا پن ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے اس نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب لڑکی نہیں رہی تھی، مگر ابھی پوری طرح عورت نہیں بنی تھی۔ اس کا دبلا پتلا جسم کسی سہمے ہوئے جانور کی طرح سمٹا ہوا تھا۔ اس کے جھجکتے ہوئے بدن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جس تجربے سے وہ گزر رہی ہے، اس پر خود اسے بہت حیرت ہے۔ خود اس کے لیے بھی اس واردات میں حیرت، بے یقینی اور انہونی کا ڈر شامل ہے۔ شاید اسی لیے وہ میرا سہارا ڈھونڈ رہی ہے، یہ سمجھے بغیر کہ میں ابھی اسی کی طرح ناتجربہ کار ہوں اور بالکل ڈھلمل بے یقین، وہ مجھ بودے سے مضبوطی و استقامت کی آس بندھائے بیٹھی ہے۔ شاید میری طرح وہ بھی اپنی بے بضاعتی اور ادھورے پن کے ڈر سے جذبوں اور رشتوں کے سہارے ڈھونڈتی ہے۔ لیکن میں تو یہ جان گیا ہوں کہ اگر یہ ادھورا کچا پن اندر سے آ رہا ہو تو اس سے رشتے اور الجھ جاتے ہیں۔ افسوس اس کے حال پر اور میرے حال پر۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں میں

www.taemeernews.com

سے کس پر زیادہ ترس آرہا ہے۔

ترحم کا یہ لمحہ پائدار ثابت نہیں ہوا۔ ایک نظر اس کی طرف .... کم زور، بے بس، اس کے سہارے کی محتاج .... اور اس کی نگاہوں میں ہمدردی کے بجائے تحقیر آ گئی۔ وہ تحقیر جو گرے پڑے اور اپنے سے کئی درجے پست لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ تحقیر جس کی تہہ میں اگر اظہار کا کوئی امکان ہوتا ہے تو وہ بھی محض کراہیت کا، اور اچانک اس کا سارا وجود تنفر کی ایک ایسی لہر سے بھر گیا جو نہ جانے کس گہرائی سے اٹھی تھی کہ اس کے آگے ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہ بہتا چلا گیا۔ تنفر کا ایک سیل تھا۔ ہاں، تنفر۔ نرمی نہیں، محبت نہیں، خوشی نہیں، ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے خلاف ناگواری کا کڑوا، تیزابی رد عمل جو دھار دار آلے کی طرح اسے کاٹتا چلا گیا۔ گہرے اندھیروں میں اگ کر پھیلنے والا احساس۔ ایسی گھن جو اب سے پہلے ایک مرتبہ کچلے ہوئے مینڈک سے آئی تھی جس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور اس پر سینکڑوں چیونٹیاں جمع ہو گئی تھیں۔ لجلجا، پچکا ہوا، گندہ۔ ایسی گھن جو اس نے صرف اپنے آپ سے اور اس جسمانی عمل سے محسوس کی تھی۔ گھن کا یہ شدید اور تلخ احساس، زیر زمین پانی کی ذخیرے کی طرح، کہیں اندر سے رس رس کر اس کی رگ رگ میں پھیلتا رہا، اس کے ریشوں میں گھل گیا۔ اس نفرت کو کوئی اور سمت نہیں ملی، تو خود اس کی ذات کا رخ کرنے لگی۔

یہ سب میری لحاتی کم زوری کا شاخسانہ ہے، اس نے اپنے آپ کو قابل نفرت گردانا۔

ہاں، مجھے اس لمحے یہ خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، اس نے عادی قنوطی کی طرح سوچا۔ نفرت نے اس کے حواس کو کس قدر تازہ کر دیا تھا۔ وہ لمحہ اپنی ایک ایک تفصیل کے ساتھ اس کے ذہن میں اجاگر ہو گیا۔ اس رات بھی وہ اس کے پہلو میں آ کر لیٹ گئی تھی، اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے سرہانے کا لیمپ بجھا کر دیوار کی طرف کروٹ بدل لیٹتا، اس نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دوسرے کا لمس بھی ایک جبر ہے، اسے یاد ہے کہ اس نے یہ سوچا تھا، اور سوچتے ہوئے اس کے لمس کا جواب دیا تھا۔ جس طرح کوئی کسی کے خط کا جواب دیتا ہے۔ محض اس لیے کہ خط لکھ دیا گیا ہے، اس کی رسید کے طور پر۔ کسی دلی جذبے کے وجہ سے نہیں، اور نہ رابطے یا مکالمے کی خواہش میں۔ لیکن وہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں تھا، زندہ لمس تھا۔ دوسرے انسان کا جیتا جاگتا لمس، جس سے وہ گزر رہا تھا .... ہر چیز کے غیر حقیقی اور بے مزہ کی اپنی مستقل کیفیت کے باوجود اپنے آپ کو اس سے گزرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا .... اور جواباً اس نے بھی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کا تو مقصد مربیانہ تھا، وہ اس کو التفات سمجھ بیٹھی ہو گی۔ اور جب وہ اپنا سر اس کے سینے پر رکھنے لگی، اس پالتو بلی کی طرح جو اپنے مالک کی ذرا سی بھی پچکار پر اظہار تشکر کے لیے خرخرانے لگتی ہے، تو اس نے بھی اس کے چہرے پر گرنے والے لمبے بال ہٹا کر اپنے پھیکے، سپاٹ ہونٹ اس کے چہرے پر رکھ دیے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس کو میکانکی عمل کی

www.taemeernews.com

طرح دہراتا رہا۔ ایسا عمل جو پسی رفتار میں آنے کے بعد، اس کی مکمل اور شخصی شمولیت کے بغیر بھی جاری رہتا ہے۔ جوں ہی اسے احساس ہوا تھا کہ اب نوبت یہاں تک آگئی ہے تو اس نے چاہا تھا کہ الگ ہو جائے، لیکن اس کے جذبات کے احترام میں اسی طرح لیٹا رہا اور کارروائی کو جاری رہنے دیا۔ اس وقت بھی اسے خیال آیا تھا کہ اس سے پہلے کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے، کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کر ہی لے۔ جیسے کہ وہ اس سے پہلے کرتا آیا تھا۔ اس نے پہلے ہی یہ طے کر رہا تھا کہ ان معاملوں کی روک تھام ضروری ہے، بلکہ بیخ کنی۔ اسے بس اٹھ کر جانا ہی تو تھا اور غسل خانے کی الماری سے وہ پیکٹ نکالنا تھا۔ پھر خول چڑھ جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر ایک دفعہ وہ اس کے لپٹے ہوئے بازوؤں سے علیحدہ ہوا، تو پھر اس کے لیے دوبارہ جا کر اس عمل میں اپنے آپ کو شریک کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس نے اپنے آپ کو جیسے اس کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ ظاہر اس طرح کر رہا تھا کہ جیسے یہ لاپرواہی ہے۔ عواقب سے بے فکری کہ کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ مگر یہ تھا راضی برضا ہونا، اپنے آپ کو تقدیر کے سامنے چھوڑ دینا۔ کچھ نہیں ہوگا، ایسے کچھ نہیں ہوتا ہے، اس نے اپنے آپ کو ہمت دلانا چاہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کے نتائج سے خائف تھا۔ بلکہ اس لیے کہ جو کچھ ہو رہا تھا اور جو کچھ ہو سکتا تھا، دل ہی دل میں اس کی اہمیت گھٹانا چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو باور کرانا چاہ رہا تھا کہ یہ محض لمحاتی اضطراب ہے۔ اگر اس کے لیے کوئی تدبیر اختیار کروں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اعتراف کر رہا ہوں کہ یہ سنجیدہ اور گمبھیر عمل ہے، جس کے نتائج بھی متشکل ہو سکتے ہیں۔ یہ تو محض وقتی ہیجان ہے، اپنے آپ کو یہ تسلی دینے کی کوشش میں اس نے اس خلش کو دبا لیا جو انجام کی طرف سے خبردار کر دیتی تھی کہ ہر عمل کے عواقب بھی ہوتے ہیں، ناگزیر اور اٹل۔ اور اگر عمل سے گزر رہے ہو تو عواقب بھی دیکھنے پڑیں گے۔ ان سے بچا نہیں جا سکتا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کے انجام کا فیصلہ صادر ہو چکا ہے۔ وہ اس سے بچنا چاہ رہا تھا۔

اس کے باوجود اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ اسی طرح جو کچھ کر رہا تھا، کرتا رہا۔ وہ دونوں میں سے کسی ایک خیال کو جھٹک کر اپنے آپ سے دور نہیں کر سکا وہ اس تذبذب میں بھی مصروف رہا۔ اس سے علیحدہ ہونا، اپنے بدن کو اس سے چھڑانا بھی ایک بہت واضح حرکت ہوتی، دو ٹوک قدم.... جس کی وہ جرأت نہیں رکھتا تھا۔ جو کچھ کر رہا تھا اس کو روک بھی نہیں سکتا تھا اور اپنے پورے وجود سے اس کا اثبات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اس سے الگ نہ اس میں پوری طرح شامل۔ اور یوں وہ اس عمل سے گزر گیا۔ اس کے بعد لاتعلقی سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ شاید یہ بھی سوچا ہوگا کہ جو ہونا تھا ہو چکا، اب جو ہوگا وہ بھی دیکھا جائے گا۔ یہ سوچنے کے بعد کروٹ لے کر سو گیا تھا۔

اس بیگانگی کے باوجود اسے معلوم تھا کہ سچ سے متصادم ہونا پڑے گا۔ اس کو ٹالا نہیں جا

www.taemeernews.com

سکتا۔ کیونکہ آئندہ کا یہ سچ سرطان کی طرح اس کے اندر پنجے گاڑ دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا رویہ ناگہانی کو جھیلنے یا اس کا سامنا کرنے کا نہیں ہے۔ یہ رویہ محض ٹالنے والا تھا کہ کسی طرح اس آنے والے دن کی پرچھائیں اس کا پیچھا کرنا چھوڑے۔ لیکن اس سے پیچھا چھڑانے کی خواہش سے کوئی ہونی کو ٹال سکا ہے۔

اسی لیے جب اس کی بیوی نے بتایا تو وہ اپنے تمام تر "مجھے پہلے سے پتہ تھا" کے باوجود بھونچکا رہ گیا۔ حیران پریشان۔ اب بے احتیاطی کے اس لمحے کو کوسنے سے کیا حاصل۔ جو ہوا، اسے تو ہونا ہی تھا۔ اگر وہ اپنے اور اس کے درمیان وہ احتیاطی روک لگا بھی دیتا جو غسل خانے والے پیکٹ کے اندر بند رہ گئی، تب بھی جسم سے جسم کا رابطہ تو ہو چکا تھا۔ ایک نہ ایک دن یہ تو ہونا تھا۔ اور اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن پھر بھی یہ کراہیت آمیز خوف....
اس نے تعجب سے ٹھٹھک کر سوچا کہ میں اپنے دل میں اسی روایتی مسرت کا جشن کیوں محسوس نہیں کر رہا جو پہلی بار اس کیفیت سے گزرنے والے لوگوں میں برپا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ میں مستقبل کی نوید سے مہم گیا ہوں۔ اس نے بہت ٹھنڈے دل دماغ سے اپنی ہیجانی کیفیت کا جائزہ لینا چاہا۔ غلطی میری ہے کہ میں نے اس جسمانی عمل کے نتائج کو اتنی سنجیدگی سے نہیں محسوس کیا تھا۔ میں یہ کیوں بھول گیا تھا کہ ایک لمس آئندہ کی شکل میں بھی اختیار کر سکتا ہے۔ آئندہ، جس کا مطلب ہوا ایک اور وابستگی۔ ایک اور وجود! یہ خیال یہ اس کی ریڑھ کی ہڈی تک ایک سرد لہر دوڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

پہلے پہل ایک مبہم سا اندازہ تو تھا۔ لیکن اب جو یہ اتنے قریب آگیا ہے کہ اس کی سانس اپنی گردن پر محسوس کر رہا ہوں، تو ایک سرد مہر اندیشہ میرے دل پر طاری ہوا جا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ جیسے کسی آسیب سے محفوظ رہنے کی دعا زیر لب دہرا رہا ہو۔ لیکن اس سے آرام نہ آیا۔ بلکہ اس کے برخلاف۔ اندر کی شورش نے اس بات کو اور تقویت پہنچا دی جو وہ جان چکا تھا، اور جس کو جاننا نہیں چاہتا تھا۔ جس کا اب اسے سامنا کرنا تھا اور جس کے ساتھ اب زندہ رہنا تھا۔ مجھی سے ہوا جو کچھ ہوا۔ اور بھلا کون اس کا ذمہ دار ہے؟ آئندہ یہ امر واقعہ پوری طرح کھل کر سامنے آئے گا۔

اس خیال کا آنا تھا کہ کڑواہٹ کی لہر پھر اٹھی۔ جس کی ان ہی اندھیری گہرائیوں سے جہاں سے تذبذب اور خوف نے جنم لیا تھا۔ لیکن اب کی بار الٹا اس کا رخ حلق کی جانب تھا۔ تیزاب کی سی جلن معدے سے اٹھتی ہوئی زبان کی جڑوں تک پھیل گئی۔ وہ تیزی سے غسلخانے کی طرف بھاگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بیسن دانی کو تھام لیا اور اسی بے بسی کے ساتھ اسے گاڑھے، زرد جھاگ سے بھرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ قے کرنے کے بعد سر اٹھایا اور اپنا سامنا کرنے کے لیے بیسن دانی کے آئینے کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ آئینے کے چوکٹھے میں اس کی بیوی کا

www.taemeernews.com

چہرہ جڑا ہوا ہے جس پر اتنا اچنبھا طاری ہے کہ جیسے وہ اس کے منہ کی بات چھینے لے رہا ہو۔

۱۹۸۷

ooooooo

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

آٹے کی آپا

www.taemeernews.com

*

کیوں ہنسی تھی وہ لڑکی؟ اب تک ذہن میں یہ گرہ باقی ہے۔

شاید وہ پہچان گئی تھی کہ میں نے جھوٹ بولا ہے۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ گڑیا میں نے اپنے لیے رنگی ہے۔

اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا تھا اس لیے۔ جھوٹے کے منہ سے بو آنے لگتی ہے، اسی کا انتباہ مجھے یاد آیا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ میں نے گھبرا کر جلدی جلدی ہتھیلی منہ کے آگے لا کر زور زور سے کئی مرتبہ سانس لیا۔ کوئی سراغ دیے بغیر میرے یہ سانس ہوا میں غائب ہو گئے۔ ان میں فرق پڑا بھی تھا کہ نہیں، میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے سانس میں جھوٹ سونگھ لیا ہو گا۔ اسی لیے مذاق اڑا رہی ہے۔ میں نے جھینپ کر تھوک نگلا۔ میں نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔ لیکن زبان لڑکھڑا گئی۔ ان قدموں کی طرح جو زمین پر جم نہ پائے ہوں۔ میں ہکلا کر رہ گیا۔ "وہ ..... وہ..... گ گ گ گڑیا..... "ہاں، ہاں، ..... گڑیا....." وہ مجھے اکسا رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں ترغیب تھی۔ اچانک اور بے پناہ خواہش سے مغلوب ہو کر میں اپنی پسند کی چیز کی طرف ہاتھ بڑھا بیٹھا تھا۔ یہ خواہش جتنی گہری تھی، اسی قدر لب میں گڑبڑا گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح ظاہر کر دیا تھا، اور اب معاملے کو اپنے قابو سے باہر ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں حیران پریشان کھڑا اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہنسی مجھے جتلا رہی تھی کہ میں اپنے جھوٹ کے تانے بانے میں اس بری طرح الجھ چکا ہوں کہ باہر نکلنے کا رستہ نہیں ملتا۔ چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح۔ اس جھوٹ کا بے تکا بوجھ لیے کبھی ادھر دوڑتا ہوں کبھی ادھر، سوائے اپنی تھکاوٹ اور دوسروں کی تفریح کے، کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔ وہ اس تلملائی ہوئی بے بسی پر ہنس رہی تھی۔ وہ مجھ پر ہنس رہی تھی۔ بلیوں والی ہنسی۔

وہ ہنسے مجھ پر، یہ تو میں نہیں چاہتا تھا۔ کسی طرح اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ مین ہولے تو اس میں سما جاؤں۔ اس کی ہنسی میرے کھسیانے پن پر تازیانے لگا رہی تھی۔ برے لیے یہ احساس سوہان روح بنا جا رہا تھا کہ میرا جھوٹ اتنا معصوم بھی نہیں ہے۔ اس کی تہہ ں ممنوعہ تاریکیاں سرسرا رہی ہیں۔ ان کے وجود کا انکشاف میرے لیے ڈراوا بن گیا۔

یا پھر یہ اس کی اپنی ہنسی تھی۔ سوچتا تو میں یوں چاہتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس موقع ے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔ سبھی لڑکیاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ ایسی بلے تہوار جیسی تفریح اسکول میں بھلا کہاں ملتی ہے ..... لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا ب انہیں کسی ایسی جگہ تفریح کا موقع ملے جہاں وہ کام کی پابندی سے آتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے

www.taemeernews.com

لیے ہی سہی، اس مقام سے وابستہ تصور بدل جاتا ہے۔ سارا کمرہ لڑکیوں کے زور زور سے بولنے، ہنسنے، خوشی کے مارے بھاگے بھاگے پھرنے کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ سب خوش ہیں تو وہ بھی ہوگی۔ یہ ہنسی اس کے اندر کی خوشی سے پھوٹی ہوگی۔ جیسے زمین کی تہوں میں سے جھرنا پھوٹ پڑتا ہے اور ترل ترل کرتا بہنے لگتا ہے۔ اس کی بہتے پانی سی ہنسی سے بڑے کمرے کا اتنا حصہ بھر گیا۔

پانی کی آواز کا کتنی دور سے پتہ چل جاتا ہے۔ یہ آواز زمین کے اندر ہی اندر میلوں تک سفر کرتی چلی جاتی ہے۔ جو لوگ زمین کے بھید جانتے ہیں، ایک ذرا کان لگا کر بتا دیتے ہیں کہ یہاں سے نکلے گا پانی۔ اس وقت تو کوئی سوال نہیں کرتا کہ یہ چشمہ آپ سے آپ کیوں پھوٹا پڑ رہا ہے۔ ایک ہنسی اتنے سوالوں کو کیوں جنم دیتی ہے۔

کتنے ہی برسوں کی مسافت میں یہ ہنسی میرے پیچھے پیچھے چلتی چلی آئی ہے دبے پاؤں۔ اور جہاں زمین کی سطح کم زور دیکھی، وہیں سے توڑ کر نکل آئی ہے، ایک بار پھر بہنے لگی ہے۔ بعض دن ہوتے ہی ایسے ہیں یا دنوں کے بعض لمحے ..... ذرا دھیان چوکا اور میں پھر اس سوال سے الجھنے لگا کہ اس میں ایسی کون سی ہنسنے کی بات تھی جو وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اور دیر تک ہنستی رہی تھی۔

آخر کیوں۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔ کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جو راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جن کے لیے کوئی شافی جواب نہیں ملتا۔ تب وہ سوال اور بھی زیادہ چبھتے ہیں۔

کئی بار یہ بھی چاہا کہ اس ہنسی کو ذہن سے جھٹک دوں۔ یہ ہنسی غیر ضروری تھی۔ اس میں ایسا کیا مطلب اور مفہوم تھا۔ ہاں، بس ایک اپنے سوا۔ اس میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ جنون کی طرح اس کا کھوج لگانے میں مبتلا ہو جاؤں۔ وہ ہنسی تھی تو ہنسا کرے، میری بلا سے۔

لیکن وہ ہنسی میرے لیے بلا بن گئی۔ بہت اپنے آپ کو قائل کرنا چاہا کہ اس لڑکی کا ہنس پڑنا ایک غیر ضروری تفصیل ہے، جس کا امر واقعہ سے محض ضمنی اور سرسری تعلق ہے۔ اس سے نہ تو اصل واقعے پر روشنی پڑتی ہے، نہ یہ اس کو سمجھنے کے لیے ایسی کنجی ثابت ہو سکتی ہے جو پیش آنے والے واقعات کو نشانیوں کی طرح کھول کر رکھ دے۔ مزید یہ کہ میں پہلے ہی اس پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ تو میں اپنے اوپر بہت جھنجھلایا کہ اب تو مجھے واقعات کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھ لینا چاہیے۔ آخر کب تک بچوں کی طرح اصل مسئلے سے ہٹ کر ضمنی فروعات میں الجھتا رہوں گا۔

یہ بھی میری ایک پرانی کم زوری ہے۔ پرانی کم زوریاں جو لولے لنگڑے اعضاء کی طرح

www.taemeernews.com

ساتھ لگی رہتی ہیں، خواہش کے باوجود بھی الگ نہیں ہوتیں۔ بس کم زوری کے اسی احساس نے جڑ پکڑلی۔ سرطان کی طرح اندر ہی اندر نمو کرتا گیا۔ مٹی گیلی ہو کر ڈھے گئی تو وہ پھوٹ نکلی..... گونجتی ہوئی، کھنکھناتی ہوئی، چکرا دینے والی ہنسی۔

ہنسی کیوں تھی وہ اور کیوں اپنا صید بنا کر رکھا ہوا اس کی ہنسی نے مجھے۔

کیوں کا تو کوئی جواب نہیں۔ کس طرح، بس یہ معلوم تھا۔ آنکھوں میں پھر وہی منظر لوٹنے لگتا ہے۔ اس کی ایک ایک تفصیل میرے حافظے پر نقش ہے۔ میں اس کو پرانی سیاہ اور سفید فلم کی طرح چلا کر دیکھتا ہوں جس میں ایک ایک حرکت الگ نظر آتی ہے ہر جنبش تصویر کا الگ فریم۔ ساکت تصویروں کا یہ سلسلہ ایک ساتھ چلے تو شبیہیں بولنے اور چلنے لگتی ہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ اس کے ہونٹ ایک خفیف سے خم کے ساتھ کھل رہے ہیں، جوں ہی اس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اتنے بڑے اور سجے سجائے کمرے میں جس پہلی چیز پر میری نظر پڑی وہ اس کے ہونٹوں کا ایک نرم، نیم محسوس رسمساہٹ کے ساتھ کھل جانا تھا، اتنی آہستگی کے ساتھ کہ میرے علاوہ شاید ہی کسی ان منہ بند کلیوں کو چٹکتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ لیکن چوں کہ میں نے دیکھ لیا تھا..... دو ترشے ہوئے کپکپاتے ہوئے کومل ہونٹوں کو بچھڑتے ہوئے .....اس لیے میں ششدر رہ گیا۔ میں حرکت نہیں کر سکا۔ جہاں کھڑا تھا، وہیں رہ گیا۔ امی نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا، انہوں نے جھٹکا دیا تو آگے بڑھا، مگر صرف اس احساس کے ساتھ کہ واشگاف ہوتی ہوئی، بے حد اجلی مسکراہٹ کی سمت جارہا ہوں جو زندگی سے بھرپور، رسیلی پھانکوں جیسے دو ہونٹوں پر بجلی کے کوندے کی طرح لپک رہی ہے۔ اس کی ہنسی تلوار کی طرح چمکی جب میں اس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا، اور اس کے ہاتھ کے اشارے کی تعمیل میں گڑیوں کی قطار کی جانب دیکھنے لگا۔ ایک پورا خانہ گڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ گڑیاں ہاتھ سے بنائی گئی تھیں۔ ان کے پہنے ہوئے غراروں، قمیضوں، ساڑھیوں اور شلواروں میں ان کپڑوں کی دھجیاں تھیں جو کبھی ان گڑیوں کو بنانے والی لڑکیوں کی ماؤں، بہنوں اور دوسری عورتوں نے پہنے ہوں گے۔ گڑیوں کے نقوش موٹے تھے، مگر بھدے نہیں: موٹے برش سے بنائی ہوئی چپٹی ناک، کالی بھونرا آنکھیں، رستے ہوئے زخم سے سرخ ہونٹ، اور گالوں پر گہرے سرخ دھبوں کی مصنوعی بشاشت۔ جسم کی شکل بنانے کے لیے ان میں روئی، چیتھڑے اور گودڑ ٹھونسا گیا تھا جس سے یہ خوب تندرست معلوم ہورہی تھیں۔ گڑیوں کو گوتھ گانٹھ کر بنایا گیا تھا، بڑی معمولی ہنرمندی کے ساتھ اور کسی خاص سلیقے کے بغیر، اس طرح کہ بنانے والوں کا اناڑی پھوہڑپن ظاہر تھا، لیکن اس کے باوجود ناگوار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بلکہ مجھے تو اس میں بھی دل کشی نظر آئی۔ ان گڑیوں میں ایک ایسا گھریلو پن تھا جو بازار میں بکنے والی اور کارخانوں میں بنائی ہوئی گڑیوں میں نہیں ہوتا..... ایک طرح کی مانوس، کنواری اور دسترس میں آجانے والی نسوانیت.....

www.taemeernews.com

اسی لیے میں نے بے دھڑک اپنی رہ دبی ہوئی خواہش ظاہر کر دی، جس کے وجود سے میں بے خبر تھا۔ لیکن اس نے اپنا احساس دلایا تو اس کا اظہار فوراً یوں کر دیا گویا یہ میرے اندر ہمیشہ سے موجود تھی اور تکمیل طلب ہونے کو بے قرار تھی۔ ان گھریلو، ان گھڑ گڑیوں نے میرے اندر اتنی گہری خواہش کو بیدار کیا جو دکانوں میں سجی سجائی، خوب صورت، زرق برق لباسوں والی، اور آنکھیں کھل بند کرنے والی گڑیوں نے بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ ساری نمائش میں سے بس یہی گڑیا چاہیے۔

اس خواہش نے مجھے بے خبری میں جا پکڑا تھا، اور اپنی گہرائی سے مبتلائے حیرت کر دیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی کیفیت تو بدلی نہیں۔ اب بھی چونکتا ہوں تو اپنے آپ کو وہیں کھڑا ہوا پاتا ہوں، گڑیوں کی اس قطار کے سامنے، ان گڑیوں کو انکشاف کے طور پر دیکھے ہوئے، اس انکشاف کی سنسنی خیز لذت کو اپنے رگ و پے میں دوڑاتے ہوئے، اور اس خفیہ مسرت سے مغلوب ہو کر ان کو چھونے یا حاصل کر لینے کی ایک اندھی، پاگل خواہش میں مبتلا۔۔۔ یہ سب کچھ محض بچوں کا کھیل ہو جاتا۔ اگر اس میں وہ ہنسی نہ گونجنے لگتی: یاد کے پس منظر میں بھی چاروں طرف سے امڈتی ہوئی، بہت صاف، گمک دار اور تمسخر آمیز یہ ہنسی مجھے کبھی آگے دھکیلتی ہے، کبھی پیچھے گھسیٹ لیتی ہے تو مجھے دھیان آتا ہے کہ میں اس تک پہنچا کیسے۔ ایک ہنسی کا فتنہ کیا کیا نہیں دکھاتا۔

اس سب کا آغاز ایک وعدے سے ہوا تھا۔ امی نے کہا تھا کہ اچھے بچے بن کر دکھاؤ گے تو اپنے اسکول لے جاؤں گی، وہاں مینا بازار لگنے والا ہے، نمائش ہوگی، خوب کھیل تماشے ہوں گے۔ امی کا اسکول..... میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کیا واقعی وہ ایسا کہہ رہی تھیں؟ میں تو خدا سے چاہتا تھا کہ کسی طرح میں بھی تو دیکھوں کہ کیا ہے وہ اسکول جہاں روز صبح امی مجھے روتا بلکتا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں اور وہی امی جو میری انگلی بھی دکھنے پر پریشان ہو جاتی ہیں، بلا ناغہ میری اس ضد کا جواب درشت انکار سے دیتی ہیں کہ مجھے بھی لے چلیں، میں بھی جاؤں گا اسکول آپ کے ساتھ۔ روزانہ کے انکار نے میرے ذہن میں امی کے اسکول کو کہانیوں کی کتاب ایسی تصوراتی جگہ بنا دیا تھا۔ کیا واقعی میں اسے دیکھ لوں گا؟ کاش ایسا ہو جائے! اس کی خاطر تو میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں کرتا بھی وہی تھا جو مجھ سے کہا جاتا تھا۔ پھر اچھا بچہ بننے کی کوشش میں، کتنے ہی دن تک میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کے کرنے کو میرا دل چاہتا ہو اور امی نے منع کر رکھا ہو۔ میں کھیلا بھی تو اس احتیاط کے ساتھ کہ کپڑے مٹی میں خراب نہ ہوں، بازار کی کسی چیز کے کھانے کا سوچا تک نہیں۔ بڑوں کا ہر بات میں کہنا مانا، سب سے تمیز کے ساتھ بات کی، صبح کو اٹھ کر منہ دھویا اور رات کو سونے سے پہلے دعا مانگی کہ اللہ میاں مجھے اچھا بچہ بنا دے۔ دعا مانگتے وقت دونوں ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔ اور گریبان کے اندر منہ ڈال کر زور سے چھو کر لیتا، جیسے امی

www.taemeernews.com

سونے سے پہلے مجھ پر کرتی تھیں، اور اطمینان سے تکیے پر سر رکھ کر سو جاتا کہ اب تو اللہ میاں سے کہہ دیا ہے، امی کہتی ہیں وہ بچوں کی ضرور سنتے ہیں، وہ مجھے اچھا بچہ بنا دیں گے تاکہ میں امی کے اسکول جاکر مینا بازار دیکھ سکوں۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ خاص موقع ہے۔ خوب رونق ہوگی، طرح طرح کی تفریحیں ہوں گی، لڑکیاں بھیس بدل کر آئیں گی، انعام ملیں گے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی۔ کسی طرح میں وہاں پہنچ جاؤں۔ صبح اٹھتے ہی تیر کی طرح اٹھ کر غسل خانے کے آئینے میں جھانک کر دیکھ لیتا کہ میں اچھا بچہ بنا کہ نہیں۔ بہت غور سے دیکھتا تو تھوڑا تھوڑا فرق تو نظر آتا کہ کہیں کہیں سے ذرا ذرا سی چم چم تھی تو سہی۔ اچھی باتیں کرنے سے چہرہ چمک اٹھتا ہے، امی نے بتایا تھا، جو بچے اچھی باتیں کرتے ہیں ان کے چہرے کی چمک سے ساری دنیا کو پتہ چل جاتا ہے۔ میں اس چمک کو خود تو نہیں دیکھ سکتا، لیکن اندر ہی اندر محسوس ضرور کر سکتا تھا۔ اور امی نے دیکھ لیا تھا۔ (امی اسی طرح اندر ہی اندر ہونے والی باتوں کو بھی دیکھ سکتی تھیں) اسی لیے میں نے بہت اطمینان کا سانس لیا تھا جب امی نے کہا تھا کہ تم اچھے بچے ہو۔ اطمینان اس پر نہیں کہ میں اچھا بچہ بن گیا تھا، بلکہ اس لیے کہ اب امی کے اسکول جانا ملے گا۔ اب میں خود جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا کہ آخر اس جگہ ایسی کون سی بات ہے جس کی خاطر امی مجھے روز چھوڑ جاتی ہیں۔ میں بڑی بے صبری کے ساتھ منتظر تھا کہ اب اس بچھڑنے کا راز سمجھ میں آئے گا۔

امی تو بڑی ہیں۔ وہ ہاں پڑھانے کے لیے جاتی ہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ بچے اسکول میں پڑھنے کے لیے لیے جاتے ہیں۔ اجی سبھی تو جاتا ہے۔ پر میں وہاں کیوں نہیں جاسکتا تھا؟ پڑھنے کے لیے بھی، امی سے نہ بچھڑنے کے لیے بھی۔ روز صبح کے رونے کے باوجود بھی مجھے وہاں جانا نہیں ملا۔ امی کا اسکول میرے لیے شہر ممنوعہ کا حکم رکھنے لگا۔ (امی کے اس دعوے سے مجھے کبھی بھی تسلی نہیں ہوئی کہ ابھی نہیں، جب بڑے ہو جاؤ گے پھر جانا۔ وہ بڑے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے جو بات بات پر کہتے تھے کہ نہیں، ابھی نہیں، جب بڑے جاؤ گے تب۔ مجھے اس وقت بھی یہ معلوم تھا کہ اتنے اہم کام بڑے ہونے تک ملتوی نہیں کیے جاسکتے۔) ڈوبتے دل کی مایوسی نے یہ تلخ سبق سکھلا دیا تھا کہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو رونے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں، جن کی حصول کے ضد میرے دل و ذہن میں تو اتھل پتھل مچا سکتی ہے حالات نہیں بدل سکتی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت چھوٹا، کم زور اور بے بس محسوس کیا۔ یہ احساس بچپن کے سارے جادو کو ختم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ احساس صرف بچپن میں کیوں ہوتا ہے کہ اپنے دکھ میں شدت اور ارتکاز کے باوجود باقی ماندہ کائنات پر ہمارا اتنا بھی بس نہیں چلتا کہ اسے اپنے دکھ کے رنگ میں رنگ دیں۔ ہمارا دکھ اس کے سامنے کتنا حقیر اور بے وقعت نظر آتا ہے۔ زندگی کے اس سب سے بڑے المیے پر بچپن کے رونے کے بعد کیا ہم بے حس ہو جاتے ہیں یا ان سے

www.taemeernews.com

مفاہمت کرلیتے ہیں؟ خیر، یہ تو الگ بات ہے شاید یا الگ نہیں ہے..... یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ طور طریقے مجھے وہاں نہیں لے جاسکتے جہاں میں جانا چاہتا ہوں۔ پھر بھی میں نے وہاں جانے کی خواہش کرنا، اور اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ڈرنا نہیں چھوڑا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا نہیں ہوگا، میں نے یہ امید نہیں چھوڑی تھی کہ ایک دن، اچانک، حیرت، انگیز طور پر، ایسا ہوجائے گا۔ (اور چوں کہ میں ایسے ان ہونے معجزوں کے ایک واقعے کے طور پر ہوجانے کو زندگی کے معمول کا حصہ سمجھتا تھا، اس لیے مجھے معلوم تھا کہ میں ابھی تک بڑا نہیں ہوا ہوں)۔ روز صبح آنکھ کھلتے ہی یہ سہم سوار ہونے لگتا کہ اب امی جانے والی ہوں گی، اب وہ چلی جائیں گی۔ اس وقت وہ موجود تھیں، میں ان کو دیکھ سکتا تھا، لیکن ان کے ہوتے ہوئے ان کے چلے جانے کا خوف مجھے گم سم کر دیتا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اب مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی، میں ان کی انگلی پکڑ لیتا اور کچھ نہ بولتا، بس خاموش آنسو آنکھ سے بہتے جاتے۔ وہ پہلے پیار سے سمجھاتیں پھر غصے میں آجاتیں۔ لیکن جوں ہی وہ میری ننھی سی گرفت سے اپنی انگلی چھڑانے لگتیں (نرم ہاتھوں کا وہ دھیرے سے مگر قطعیت کے ساتھ مجھ سے علیحدہ ہونے لگنا مجھے ابھی تک یاد ہے..... یہ مجھ پر بیت جانے والا سب سے بڑا ظلم ہے۔ زندگی بھر میں جو کچھ بھی پیش آیا، اس میں سے کوئی بھی واقعہ میرے لیے اس قدر دل خراش ثابت نہیں ہوا جتنا کہ ان مہربان ہاتھوں کا اپنے آپ کو مجھ سے چھڑا لینا) میں سمجھ جاتا تھا اور کب کب کے جمع کیے ہوئے، دل میں سنبھال کر رکھے ہوئے آنسو چھلک اٹھتے۔ اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ امی کا جانا ضروری ہے، اس لیے کہ وہ چیزیں لے کر آئیں گی، اور اچھے بچے روتے نہیں ہیں، ورنہ امی کو بے کار صبح صبح غصہ آجائے گا آنسو آپ ہی آپ بہے جاتے۔ (چوں کہ میں ان پر قابو نہیں پاسکتا تھا، اس لیے اور بھی جان گیا تھا کہ میں بڑا ہونے والا ہوں)۔

یہ روز دہرایا جاتا تھا۔ پھر بھی مجھے دکھ دیتا تھا۔ جاتے وقت، بہلانے کے لیے مجھے امی بوا کے سپرد کر جاتیں۔ یہاں سے فلم میں ایک نیا چہرہ داخل ہوتا ہے۔ شاید یہ داخل تو اس سے پہلے ہوچکا ہے، اس کا کردار یہاں سے پہچانا جانے لگا ہے۔ دن کے ایک حصے پر امی کا کردار حاوی ہوجاتا ہے، اور دوسرے حصے پر بوا کا۔ میں نے ہمیشہ اپنی وفاداریوں کو تقسیم ہوتے ہوئے پایا ہے۔ ابھی تک سمجھ نہیں پایا ہوں کہ اس کا الزام کس کے سر جائے گا۔ لیکن جو کچھ ہوا، اس کا بیان ابھی ختم نہیں ہوا ہے، الزام کی بات تو بعد کی ہے۔ امی کا کردار..... یہ چلتی بولتی تصویر..... رخصت ہو رہا ہے۔ مجھے اسے الوداع کہنا چاہیے۔ الوداع کے لیے ہاتھ ہلانا، ہلائے جانا، شاید اس خواہش کا اظہار تھا کہ یہ جلدی سے واپس آجائیں۔ میں اپنے آپ کو زبردستی بوا کی گود سے چھڑا لیتا کہ امی کو خدا حافظ تو کہہ لینے دو۔ پھر دوڑتا ہوا کھڑکی تک جاتا اور کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے سے اس وقت تک جھانکتا رہتا، سہمے ہوئے دل اور امڈتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ہاتھ ہلائے جاتا جب

www.taemeernews.com

تک کہ وہ گلی کے موڑ پر پیلے مکان کے پیچھے اوجھل نہیں ہو جاتیں تھیں۔ (کتنی نفرت تھی مجھے اس پیلے مکان سے۔ اور گلی کے اس موڑ سے۔ جس کے پیچھے اپنے پیارے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اب بھی میرے ذہن میں موت کا تصور ایک پیلے مکان کے طور پر ہے، جو گلی کے موڑ پر بنا ہوا ہے۔ کس قدر ظالم تھی اس موڑ کی یہ اٹل قطعیت کہ اس کو جتنا چاہے تکے جاؤ، وہاں سے کوئی چہرہ ابھر کر نہیں آئے گا کہ آکر میرے آنسو پونچھے اور دو میٹھے بول دلاسے کے بولے۔ میں بچھڑ کر اکیلا ہی رہی رہ گیا۔) وہ غائب ہونے سے پہلے خود بھی ہاتھ ہلاتی تھیں۔ اب میں اکثر اپنے آپ کو سوچتا ہوا پاتا ہوں کہ اس وقت انہیں کیسا لگتا ہوگا، کھڑکی میں یہ اداس چہرہ، جو آگے جانے والے ہر قدم کے ساتھ چھوٹا پڑتا جاتا ہوگا، اور دھندلا، تھوڑا اور ادھورا، پھر غائب ..... یہاں تک کہ اس پر تحریر شکایت بھی۔ انہیں کیسا لگتا ہوگا، میں نے بہت مرتبہ اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھ کر سوچنا چاہا۔ لیکن کچھ بات بنی نہیں۔ ان سے پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ میں ان سے پوچھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس لیے کہ جو کچھ ہوا اس کو انہوں نے کسی اور طریقے سے دیکھا ہوگا۔ کسی نئے اور مختلف طریقے سے واقعات کے اس سلسلے کو دیکھنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میرے ذہن میں اب یہ تصویر بہت پختہ ہو گئی ہے کہ جو کچھ ہوا تھا وہ یوں تھا۔ اس میں تبدیلی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوگی۔ میں اپنی اس واردات کے تجربے پر راسخ ہوں اور اس کا پابند بھی۔ میری واردات اب وہ کھن کھجورا ہے جس کے پنجے دماغ کے گودے میں پیوست ہیں۔ اسے اب بھلا کیسے الگ کیا جاسکتا ہے۔

جاتے وقت امی مجھے بوا کو سونپ کر جاتی تھیں۔ بوا اب مجھے ایک مخصوص خوشبو کے حوالے سے یاد ہیں۔ گرم پسینے اور باسی پھولوں کی ملی جلی خوش بو۔ وہ اپنے کپڑوں کے صندوق میں، کپڑوں کی تہہ کے درمیان، چنبیلی اور موتیا کے پھول رکھتی تھیں۔ گرمی کے موسم میں وہ پاس سے گزرتیں تو پسینے کے ساتھ ساتھ باسی پھول کی دبی دبی مہک آتی تھیں۔ یہ خوش بو ان کے پورے وجود کو میرے لیے مشخص کر دیتی ہے۔ (کسی وقت مجھے بوا کی کہانی بھی سنانی ہے۔ لیکن اپنی واردات کے اس کھن کھجورے سے نجات ملے تو۔) یہی وہ خوش بو ہے جو ان کی گود اور ان کے پیار سے وابستہ ہے۔ "میرا بچوا" وہ میرا حد سے زیادہ لاڈ کرتی تھیں، اور گود میں بھر کے، اپنے سینے سے لپٹا کر، منہ چومے جاتیں۔ ان کے اس والہانہ پن کے دوران ان سے لپٹ کر، میں اس خوش بو کے اڑے اڑے لمس کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ ابھی یہاں ہے اور ابھی غائب ..... خوش بو بھی تو اس آنکھ مچولی کا حصہ تھی کہ چیزیں اور لوگ ابھی یہاں ہیں اور ابھی آنکھ اوجھل۔ ان کے غائب ہونے سے زیادہ دکھ جس بات پر ہوتا تھا وہ یہ تھی کہ ان کے لیے جو حیرت اور کشادہ دل قبولیت اور ان سے ہم آہنگ ہو کر وفور کا جذبہ جو میرے اندر ہے باقی سب میں کیوں نہیں ہے۔ یہ تضاد مجھے تو دو نیم کر ڈالتا تھا۔ مثلاً یہی بوا کا مجھے اپنے سینے سے

www.taemeernews.com

لگائے رکھنا۔" اسے ان بڑی بی کے لاڈ پیار نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے"، امی کہتی تھیں۔ خبطی بڑھیا ہے، ساری زندگی مجھے ان کے بارے میں الزام سننا تھا، تمھیں بھی اپنی طرح مراقی بنا کر رکھ دیا ہے۔ "بے چاری غم زدہ ہیں، اس لیے کوئی ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ورنہ تمھیں اس طرح کلیجے سے لگائے رکھنا چاہتی ہیں، جیسے بندریا مردہ بچے کو اپنے سے جدا نہیں کرتی۔" شاید حقیقت یہی تھی کہ میں وہی مردہ بچہ تھا، جس کو دونوں میں سے کوئی بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دراصل میں ان دونوں کے درمیان ایک خاموش قضیے کی بنیاد تھا۔ وہ دونوں مجھ کو حاصل کرنے کے لیے متحارب تھیں۔ دونوں میں کشمکش تھی کہ میں ان کا بچہ بن جاؤں۔ لیکن دونوں میرے ایک ہی حصے پر قابض ہوسکتی تھیں۔ صبح کو میں بوا کا تھا اور شام کو امی کا۔ لیکن ان دونوں میں زیادہ اہم میرے لیے اجی تھا۔ کیوں کہ وہ اسکول جاتا تھا۔ اس کی تائید اور پسندیدگی حاصل کرنے میں آرزو کرتا تھا۔

بوا اور امی سے تو میں اپنی ہر بات منوا سکتا تھا۔ اجی کو خوش کرنا بڑا مشکل تھا۔ لیکن زیادہ اہم بھی تو تھا۔ اسے بہت سے کھیل آتے تھے اور وہ اسکول جاتا تھا، بس میرے حساب سے تو وہ اتنا اونچا تھا کہ اس کا سر بادلوں میں تھا۔ اس کی دھونس اور مذاق اڑاتی ہوئی جھڑکی بھی مجھے قبول تھی۔ "تم دراصل بوا کے بیٹے ہو" اجی مجھے شک میں مبتلا کر دیتا تھا۔ "ہم لوگوں نے تم کو ترس کھا کر پال لیا ہے۔" یہ شبہ کبھی پوری طرح رفع نہیں ہو سکا۔ اس وقت سے میرے ذہن میں ایک دبا دبا سا خیال ہے کہ میں ہوں کوئی اور، یہ لوگ مجھے بتا نہیں رہے۔ میں کہیں نہ کہیں ادل بدل گیا ہوں۔ شاید یہ گھر میرا نہیں ہے اور نہ یہ لوگ۔ اس کے بعد سے میں ہمیشہ سارے لوگوں سے ذرا فاصلے ہی پر رہا، درمیان میں غیریت کا ایک گمان جو آگیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے بھروسے نے بھی تو اس فاصلے کو بڑھایا۔ اس کے بعد میں کبھی اپنے آپ کو ان باتوں پر اعتبار لانے پر آمادہ نہیں کر سکا جو لوگ کہتے ہیں۔

خیر، یہ تو بعد کے مرحلے ہیں۔ اس وقت تو میں ان سب سے بے خبر تھا۔ اپنی دھن میں مگن۔ میں اب بھی اپنے اس روپ کو دیکھ سکتا ہوں۔ بوا آٹا گوندھ رہی ہیں۔ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا ان کے لمبے، سفید دوپٹے کے آنچل میں انگلی لپیٹ کر سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ (مجھے کیا کرنا چاہیے کہ مجھ پر سہم نہ طاری ہو؟) مجھے کچھ کرنا چاہیے اس ڈراتے ہوئے اکیلے پن سے چھٹکارا پانے کے لیے۔ مجھے شکلیں بنانی چاہئیں اور جانور۔ (میرے بچپن میں جادو کی ابتداء اسی طرح ہوئی تھی۔ اور اس جادو سے ہی داستانوں کا خمیر اٹھا)۔ میں بہت صبر اور استعجاب کے ساتھ دیکھتا تھا کہ بوا چیزوں کے روپ کس طرح بدلتی ہیں۔ وہ لگن میں آٹا بھر کر پانی کا ایک چھینٹا مارتیں کہ سفوف جیسا اڑتا ہوا غبار ایک جگہ ٹھہر کر شکل اختیار کرنے لگتا۔ آٹا میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہاتھوں میں کیا سے کیا ہونے لگتا۔ میں بہت انہماک سے دیکھتا رہتا، روز دیکھتا

www.taemeernews.com

پھر بھی تھکتا نہیں، اور اس دیکھنے میں رونا یا ڈرنا بالکل بھول جاتا کہ ذرا سے پانی سے آٹے کا بکھرا ہوا ڈھیر یکجا ہونے لگا ہے، اب یہ ٹھہرا اور ٹھہر کر ایک جسم حاصل کرنے لگا، گاڑھی اور گندھی ہوئی شکل، بہت واضح، مگر ایسی نرم اور لوچ دار کہ اس کو جیسا جی چاہے بنالو۔ یہی کچھ میں نے کرنا سیکھا۔ وہ آٹے کے اس گندھے ہوئے جسم سے چٹکی بھر توڑ کر میرے آگے رکھ دیتیں۔ میں وہ تو نہیں کر سکتا تھا جو ان کو کرتے ہوئے دیکھتا تھا کہ اس چکنے، پھسلواں اور بے ہئیت لوچ سے توڑ توڑ کر گول گول پیڑے بناتیں، پھر ان کے گول اور ابھرے ہوئے پیڑوں کو بیلن سے داب کر چپٹا کرتیں اور بیل کر لمبوترا، اور اس ورق کو توے پر ڈال دیتیں جہاں یہ آنچ پر سنک کر روٹی بن جاتا تھا۔ میں اپنے حصے سے ایسی کوئی مفید شے نہیں بنا سکا۔ میں اس گندھے ہوئے آٹے کو انگلیوں سے دبا دبا کر کبھی گائے بناتا کبھی بکری۔ یہاں سے پچکا کر کھینچ دیا تو ٹانگیں بن گئیں، اور اتنا حصہ چٹکی سے مسل کر گول کر دیا تو اس کا سر ہو گیا، جس میں تیلی سے شگاف بنا دیا تو یہ اس کی آنکھیں ہو گئیں اور یہ رہے کان۔ یہ جناب ہو گئی گائے تیار۔ اب اسے اپنے پاس رکھوں گا اور اس سے کھیلوں گا، یہاں تک کہ بوا مجھ سے وہ جانور مانگ نہ لیں۔ بوا کہتی تھیں کہ میں ایک دفعہ کے مانگے پر جانور چپ چاپ ان کے حوالے کر دیتا تھا، ان سے مزید کھیلنے کے لیے ضد نہیں کرتا تھا اور اس بات پر بالکل راضی نظر آتا تھا کہ اپنے گھڑے ہوئے ان کھلونوں کو چولہے میں جانے دوں جہاں سے وہ روٹی میں پک کر نکلیں گے۔

چولہے میں آنچ بھڑکتی تو بوا کے پر شفقت چہرے کی ایک ایک جھری جیسے لَو دینے لگتیں۔ ایسا لگتا کہ وہ اس روشنی کا مہربان روپ ہیں۔ آگ کی ادھوری روشنی میں کبھی وہ پورے کی پوری روشن نہیں ہوئیں۔ آدھی بجھی ہوئی اور آدھی تیز آنچ کے سرخ، نارنجی، شعلوں کی طرح لپکتی ہوئی، وہ بڑی انوکھی اور بھید بھری نظر آتی تھیں۔ جو کچھ وہ کہتیں تھیں بڑی پراسرار گہرائیوں سے آتا ہوا لگتا تھا، کسی اہم راز کا حامل۔ اس سے ان کی سنائی ہوئی ساری کہانیاں سچ معلوم ہونے لگتی تھیں۔ (اور چونکہ میں ان کی کہانیوں پر اعتبار کرتا تھا۔ اس لیے مجھے معلوم تھا کہ میں ..... مگر کیا؟ کہانی اور سچ کے درمیان ایک پتلی سی حد بندی ہی تو ہے، جس کا انحصار سنانے والے کے اعتبار پر ہے۔) وہ مجھ سے کہتیں ..... اور لہجہ بھی ایسا کہ اعتبار کا مفہوم میں نے وہیں سے سیکھا ..... لاؤ آج گائے کی روٹی پکائیں۔ میں وہی کرتا تھا جو مجھ سے کہا جاتا تھا۔ (اچھے بچے ایسا ہی کرتے ہیں، مجھے سکھایا گیا تھا۔) میں حیران آنکھوں سے ان کی طرف تکتے ہوئے گائے ان کے حوالے کر دیتا۔ اور خاموش توجہ کے ساتھ دیکھتا رہتا کہ ان کے بیلن کے نیچے گائے چپٹی ہو گئی ہے۔ "گائے پر پہیا پھر گیا ہے" وہ ساتھ ساتھ بتاتی جاتیں۔ اب گائے اس آٹے میں واپس چلی گئی ہے جس سے نکل کر آئی تھی، اب توے پر جل بھن رہی ہے، اب گائے کی روٹی پک گئی ہے۔ یہ میرا اپنا کھیل تھا، گائے کی روٹی میرا راز تھی۔ میں نے اس کے

www.taemeernews.com

بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا۔ (بتایا بھی کیسے؟ میرے پاس وہ اعتبار کہاں تھا جو بوا کے پاس تھا۔) اس وقت بھی نہیں بتایا جب سارے لوگ دستر خوان پر بیٹھ جاتے اور وہی روٹی ڈلیا میں سامنے آجاتی جو گائے بن کر میرے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ میں انہیں بھلا کیا بتاتا کہ جس روٹی کے وہ نوالے توڑ رہے ہیں، اس سے پہلے کیا کچھ رہ چکی ہے۔ بتا بھی دیتا تو وہ سمجھ نہیں پاتے۔ وہ تو اس وقت بھی نہیں سمجھتے تھے جب ایسی روٹی میرے سامنے آجاتی اور میں اس کو کھانے کے بجائے بھوکے پیٹ اٹھ جاتا۔ بھوکے پیٹ نہ اٹھتا تو اور کیا کرتا؟ وہ ایسی باتیں نہیں سمجھتے تھے۔ اگر ذرا بھی سمجھ رکھتے تو پھر اس وقت حیران نہیں ہوتے جب میں انہیں دیکھتا تھا۔ ان کی حیرت بھی عجیب تھی، بڑھ کر ناراضگی میں تبدیل ہو جاتی۔ کھانے کا سارا وقت میرے لیے تناؤ میں گزرتا کہ میں ان روٹیوں کا دھیان رکھنے کی کوشش کرتا جن کی نشانیاں مجھے یاد تھیں۔ نشان والی روٹی ڈلیا میں سے نکال کر کوئی اپنے سامنے رکابی میں رکھ لیتا تو دم سادھے میں دیکھتا رہتا۔ اب اس نے نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور میں چپ چاپ دیکھ رہا ہوں کہ وہ دانتوں کے بیچ میں آکر پس رہا ہے۔ یہ اجی نے گائے کی ٹانگ نوچی، اس کو سالن میں ڈبویا، نوالہ بنا کر منہ میں رکھ لیا۔۔۔ اس گائے کی ٹانگ کو جسے میں نے آٹے میں شکل دے کر بنایا تھا اور جس سے کھیل کر صبح کا سونا اکیلا پن کاٹا تھا۔ اب گائے کا پیٹ اس کے دانتوں میں دبا۔ اب یہ گائے پوری ہضم ہوئی۔ میں انہیں گائے کو یوں سموچا نگلتے ہوئے دیکھتا اور کچھ بھی نہیں کہتا، پھر بھی کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ انگلیاں اٹھانے لگتے۔ "دیکھو، یہ پھر وہی کرنے لگا، کیا ہو جاتا ہے اسے؟"

امی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ پریشان ہو جاتی تھیں۔ "خود بھی نہیں کھاتا، دوسروں کو دیکھتا رہتا ہے، جیسے نظر لگا رہا ہو۔ پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے اسے۔"

بے چاری۔ وہ ساری عمر مجھ سے محبت کیے گئیں، یہ جانے بغیر کہ کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ اور اپنی محبت کی شدت کی وجہ سے اس کے نہ جاننے پر کڑھتی، جلتی رہیں۔ ان کو پتہ چل بھی نہیں سکا کہ وہ آزار کیا ہے جو مجھے اندر ہی اندر کھاتا جاتا ہے۔ میں نے انہیں بتانے کو کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھ بھی نہیں پاتیں۔ اب کم از کم یہ بھرم تو ہے کہ انہیں معلوم نہیں تھا۔

"تم اس پر سختی کیا کرو۔ ایک تو اس خبطی بڑھیا نے جانے کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ ایک تمہارے وقت بے وقت کے دلار نے اس کا یہ حال کر دیا ہے۔ غضب خدا کا، اتنا بڑا ڈھونک کا ڈھونک ہو گیا ہے اور اب تک بستر میں پیشاب کر دیتا ہے ..... دنیا تو یہی سمجھے گی کہ مصیبت کی ماری بہن گھر آپڑی ہے تو میکے والے کھانے کو نہیں دیتے جو اکلوتا بچہ ہر وقت ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑے دوسروں کے نوالے گنتا رہتا ہے۔ دنیا تو ہمارے جنم میں تھوکے گی۔ بچہ ایسا اٹھایا ہے کہ حلق کا دربان۔" امی ان کی ہر وقت کی نصیحتیں اور ہدایتیں سنتی رہتیں اور چھپ چھپ کر آنسو بہاتی رہتیں۔ وہ اپنے آپ کو مجھ پر سختی کرنے کے لیے آمادہ نہیں کر

www.taemeernews.com

سکیں۔ لیکن میری طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہوتے اور ایک ان کہی، دکھ بھری ملامت کی تحریر ہوتی۔ گزرتے برسوں میں، میں نے اس ان کہے دکھ اور ملامت کو اور گہرا ہوتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ان سے دور ہٹتا گیا، خاص طور پر اس زمانے میں جب ان کو میری اشد ضرورت تھی۔

"میں تو چاہتی ہوں کہ سب میرے بچے کو اچھا کہیں"، وہ گلوگیر آواز میں کہتیں۔ وہ مجھے یہ بنانا چاہتی تھیں۔ مجھے لگتا کہ میں بھی ان کے ہاتھوں میں گندھے ہوئے آٹے کی ایک چٹکی ہوں۔ مگر میں تو جیسے خمیر کیا ہوا آٹا تھا کہ کسی کے ہاتھوں میں ڈھلتا نہیں تھا، بوا نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ تالی بجا کر دہراؤں:

تما بیجی تما بیجی مکن مکن
بوئی بوئی بتیاں مکن مکن
اچھی اچھی بتیاں کن کن کن

میں اس سبق کو دن بھر دہراتا، جیسے یہ منتر ہے کہ اس کے پڑھنے سے میں ویسا بن جاؤں گا جیسا سب لوگ چاہتے ہیں۔ میں کسی کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا، اور انجانے میں ان کو اتنی اذیت دینے کی وجہ سے اپنے آپ پر نفرین کرتا۔ میں اپنے آپ کو برا سمجھنے لگا تھا۔ میں جس قسم کا بنتا جا رہا تھا، اس کو روکنا بھی تو میرے بس میں نہیں تھا۔ کسی طرح زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا، اپنے قابل نفرت، شرمندہ وجود کے ساتھ۔ زمین کی تہوں میں رینگتا ہوا اتر جاتا۔ سانپ کی طرح۔ میں نے ہمیشہ ان بچوں کے بارے میں رشک سے سوچا ہے کہ جو اپنے ماں باپ کے لیے تکلیف کے بجائے باعث فخر بنتے ہیں۔ جیسا وہ سانپ والا بچہ بنا تھا۔

اس سانپ والے بچے کا احوال بھی بوا نے سنایا تھا۔ عجیب بات تھی کہ بوا اس کشمکش کو جبلی طور پر پہچان سکتی تھیں جو میرے اندر جاری تھی۔ وہ اس پیپ بھرے، کلستے ہوئے پھوڑے کی جڑ میں دبی ہوئی کیل پر اپنا ہاتھ رکھ سکتی تھیں، جس کی موجودگی کا دوسروں کو قیاس ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ حالاں کہ کرتی وہ صرف اتنا تھیں کہ آٹا گوندھتے ہوئے، روٹی پکاتے ہوئے مجھے اپنے پاس بٹھا لیتی تھیں، میں اپنی لال پایوں والی ننھی سی پیڑھی گھسیٹ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا اور جو وہ سناتی رہتیں، سنتا جاتا۔ روٹی پکاتے وقت انہیں کتنی بہت سی کہانیاں یاد آنے لگتیں۔ مجھے تو سب سے زیادہ وہ سانپ اور بچے والی پسند تھی۔ ہر دوسرے، تیسرے دن ضد کرتا تھا کہ وہی والی سنائیے وہی والی۔ اور وہ نام لیے بغیر سمجھ جاتیں (یہی تو ان کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ اشارتاً کہی ہوئی بات بھی سمجھ جاتی تھیں)، اور ہنسنے لگتیں ..... یہ ہنسی اور طرح کی

www.taemeernews.com

تھی، دانت ٹوٹے پوپلے منہ کی ہنسی جس کے دوران پان کی پیک باچھوں سے بہنے لگتی اور آنکھوں میں وہ شوخی جو مشترک شرارت کے آغاز پر بچوں کی آنکھوں میں چمکنے لگتی ہے۔ پھر پوچھتیں: "دال کھا، چاول کھا والی؟"

اس سوال کا مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ کہے بغیر بھی انہیں معلوم تھا کہ میری مراد اسی کہانی سے ہے۔ وہ ہمیشہ سمجھ جاتی تھیں کہ مجھے کیا چاہیے۔ دال کھا، چاول کھا بھی گائے کی روٹی کی طرح میرے راز کا حصہ تھا۔ اس میں سانپ ہے، یہ تو میں اب سمجھ پایا ہوں۔ ورنہ بوا نے تو کبھی سانپ کا نام نہیں لیا۔ (پھر بھی انہوں نے سانپ کی موجودگی کا احساس دلایا)۔ شاید وہ سمجھتی ہوں کہ دن میں سنائی جانے والی کہانی میں سانپ کا نام نہیں لینا چاہیے۔ "اس کا نام نہ لینا ورنہ نامراد کہیں بھی ہوگا، یہیں آجائے گا"، بوا نے مجھے خبردار کر رکھا تھا سو میں اس کا دھیان اس طرح کرتا کہ اس کا نام نہ آنے پائے۔ یہ بھی میں نے بوا سے سیکھا تھا ..... چیزوں کا نام لیے بغیر ان کو یاد کر لینا۔ اب میں کتنی آسانی سے لوگوں کی باتوں کو ایک سادہ سا سبب دے دیتا ہوں۔ اتنی آسانی سے تو اس وقت ان چیزوں کو نام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ چیزیں جو محض سیال احساس تھیں، کلبلاتا ہوا، رینگتا ہوا احساس، محض ایک نام اور اس نام کا خوف۔ اس کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دینا، ورنہ ڈس لے گا۔ انہوں نے اس کا نام لیا نہ میں نے، لیکن میں سمجھ گیا کہ جب یہ احساس سے بڑھ کر جسم اختیار کرنے لگے تو اس کا سر کچل دینا چاہیے۔

میری طرح سانپ اس بچے نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے بھی جبلی طور پر احساس ہو گیا تھا کہ اس سر اٹھانے اور پھن کاڑھنے والے کو، اس رینگنے اور مٹی پر سرسرانے والے کو مسل دینا چاہیے۔ اس کا باپ اسے بٹھا کر کہیں گیا تھا۔ کہاں چلے جاتے ہیں یہ باپ، کہانی نے مجھے نہیں بتایا۔ اس دن سے مجھے ایسی کہانیوں سے نفرت ہے جن میں جو کچھ بتایا جا رہا ہے اس کے دونوں طرف ایک سفید سا خلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کہانیاں ہر طرف سے بھری ہوئی ہوں۔ شاید وہ بھی کہہ گیا ہوگا کہ اچھے بچے بنے رہنا۔ اچھے بچے بنے رہو گے تو اگلی بار تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ اگلی بار کے وعدے کے ساتھ ساتھ، اس کے لیے رکابی میں ایک طرف چاول رکھ گیا، ایک طرف دال۔ اور اس سے کہہ گیا دال کھا، چاول کھا، میں ابھی آیا۔ بچے نے ابھی کھانا شروع نہیں کیا ہے۔ وہ رکابی سامنے رکھے ہوئے بیٹھا ہے۔ کہانی تھمی ہوئی ہے کہ بوا میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی ہیں اور میں سانس روکے بیٹھا ہوں۔ کیا اس مرتبہ بھی بچہ سانپ کو پکڑ لے گا۔ کہیں سانپ کاٹ نہ لے اسے۔ وہ بے خبر بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ رکابی کی طرف ہاتھ بڑھاتا، زمین میں سرسراہٹ ہوئی، گھاس ہلنے لگی۔ اس نے دیکھا۔ کچھ نظر آیا۔ ہوا ہوگی۔ وہاں پر گھاس اور زمین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گھاس پھر ہلی۔ ایک حرکت، جو گھاس میں کہیں گم ہو گئی۔ پھر

www.taemeernews.com

اس جنبش کو زمین کے رنگ سے علیحدہ دیکھا۔ ایک لمبی، پتلی سرسراہٹ جو دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی، اور اس جنبش کا ایک جسم بھی تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ کیا ہے۔ جو کچھ بھی تھا اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے غور سے دیکھا کہ یہ جو ہے، مٹیالا ہے، زندہ ہے، لمبا ہے، سرسراتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ یہ سرسراہٹ ایک بدن رکھتی ہے جسے چھو کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لمس سے اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ بچے نے وہی کیا جو اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا۔ وہ ہاتھ نہ آتا تھا۔ ہاتھ میں بل کھاتا تھا۔ لیکن بچہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا مچلتا ہوا چکنا لمس اپنی بے قرار جسمیت کا احساس دلاتا تھا۔ اور اسے خوش کرنے کے لیے ..... ابتداء میں محض اسے خوش کرنے کے لیے ..... اس کو دعوت دی دال کھا، چاول کھا۔ اس سے دوستی کرنے کے لیے اس کو کھانے میں شریک کرنا چاہا۔ مگر وہ جو اس کے ہاتھ میں دھڑکتا تھا اور پھسلا پڑتا تھا، اس کے کہنے پر بھی کھانے پر تیار نہ ہوا۔ یوں ہی اس کے ہاتھ میں بل کھاتا اور سانپ لہریں بناتا رہا۔ اس نے اسے کھانے پر مجبور کیا۔ اس نے پہلے لے جاکر اس کا منہ دال میں دیا پھر چاول میں۔ اس سے کہا دال کھا، چاول کھا۔ اسے کھانے پر اکسانے کے لیے، اس سے رشتہ استوار کرنے کے لیے، اس کو پہلے دال پر لے جاکر رکھتا پھر چاول پر، اور اس کو بتاتا جاتا کہ دال کھا، چاول کھا۔

ایک اضطراری جبر میں یہی کیے گیا۔ جب اس کا باپ واپس آیا اور بچے کو بند ہاتھ بار بار ایک طرف پھر دوسری طرف لے جاتے ہوئے دیکھ کر وہیں سے چیخنے لگا۔ اس کے شور سے بچہ گھبرا گیا، اور سہم کر اس کے لمس کے اثر کو چھپانے کے لیے اپنے منہ کی طرف لے جانے لگا کہ باپ نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے چھین لیا ..... اب وہ ساکت تھا ..... اور دور پھینک دیا۔ وہ اس کو چیختے ہوئے اور پھینکتے ہوئے شور مچا رہا تھا ..... مردہ سانپ۔ اس نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ بچے نے سانپ پکڑ کر مارا ہے۔ جو سنتا وہ آتا، بچے کو پیار کرتا اور کہتا کہ بچہ بڑا جی دار ہے، خیریت ہو گئی، اوپر والے نے افعی سے بچا لیا۔ وہ سب اس کے گرد جمع تھے، اسے چمکار رہے تھے، اونچی آوازوں میں بول رہے تھے، مگر ان سب کے بیچ وہ گم متھان بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ سے وہ بھی لے لیا گیا جسے وہ تھامے رکھنا چاہتا تھا۔ اور دال کھا، چاول کھا والی رکابی بھی پھینک دی گئی، کیوں کہ کسی نے پکار کر کہا کہ دیکھو سانپ نے اپنا سارا زہر اس میں تھوک دیا ہے۔ لیکن کسی نے بھی اس کے خالی ہاتھوں کی طرف نہیں دیکھا۔ مجھے تو حیرت اسی بات پر ہوئی تھی۔ میں اکیلا بیٹھا ہوا ہمیشہ کی طرح آپ ہی آپ کھیل رہا ہوتا تو اچانک اس بچے کی بات یاد آجاتی اور میں سوچتا، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا کرتا۔ میں دل ہی دل میں دہراتا، دل کھا چاول کھا دال کھا چاول کھا۔ اور مضبوطی سے بھنچی ہوئی مٹھی کی طرف دیکھتا جیسے اس میں

www.taemeernews.com

وہ کلبلا رہا ہو، وہ..... وہی۔ میں نے اسے تھام لیا ہے، اس کا ہموار لمس میری ہتھیلی کو سہلا رہا ہے، وہ نبض کی طرح دھڑک رہا ہے، گرم، بے چین، اور میں نے اسے کس کر پکڑے نہیں رکھا تو پھسل جائے گا۔ اب میں اس سے کہوں گا، دال کھا چاول کھا..... مگر میں خالی ہوا کو مٹھیوں میں بند کرنے کی کوشش کرتا رہ جاتا۔ وہ رات کو نیند میں سرسراتا ہوا بھی آ جاتا۔ بستر پر رینگتا ہوا، چادروں پر بے آواز سانپ لکیریں بناتا ہوا، میرے چاروں طرف پھن کاڑھے ہوئے جھومتا ہوا۔ میں نیند میں چونک کر ہاتھ پاؤں پٹخنے لگتا اور امی کو مجھے تھپکنا پڑتا۔ بعد میں وہ مجھے بتایا کرتی تھیں۔ کبھی وہ امی کے تھپکنے سے چلا جاتا اور کبھی دبک کر بیٹھ جاتا کہ جیسے ہی ان کا تھپکنا ختم ہو اور وہ کروٹ بدلیں، وہ چادر کی سلوٹوں میں اپنی کمین گاہ سے نکل آئے اور پھر میری طرف رینگنے لگے۔ چادر پر سرسراتا ہوا، پیٹ کے بل رینگتا ہوا، آستین کے راستے وہ کپڑوں میں گھس جائے اور سارے جسم پر پھرنے لگے۔ میں اسے محسوس کر سکتا ہوں، ہاتھ سے پکڑ نہیں سکتا۔ دال چاول نہیں کھلا سکتا۔ لیکن یہ پانی مانگتا ہے۔ منہ لگا دیتا ہے، پانی پینے لگتا ہے، میری آنکھ کھلتی ہے تو میں گیلا پڑا ہوا ہوں۔ بستر پر وہی پیلے پیلے دھبے اور امی کی آنکھوں میں وہی دکھ بھری ملامت کہ آج پھر بستر میں پیشاب کر دیا.....

نیند میں اس سانپ کا سہچھا کرنا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر دال چاول کھلانے کی خواہش کرنا میں نے اس وقت چھوڑا جب امی کے اسکول جانے کی خاطر مجھے اچھا بچہ بننا پڑا۔ میں نے کوشش کی کہ اتنے دن نہ اس کی کہانی سنوں، نہ اس کو یاد کروں، مبادا وہ جستجو پھر سر اٹھائے اور اس کے لمس سے ہاتھ کھجلانے لگیں۔ لیکن اتنے دن تک میں سانپ کو اپنے خوابوں کی جنت سے جلاوطن رکھنے میں کامیاب رہا۔ اسی کے انعام میں مجھے امی کے اسکول جانا ملا۔

اسکول جانے کے لیے جتنے پاپڑ بیلنے پڑے، وہ تو یاد رہ گئے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس مینا بازار کی بہت کم تفصیل یاد رہ گئی ہے۔ چند ایک چھوٹی موٹی، بظاہر غیر ضروری سی باتیں، مثلاً گڑیوں کی بناوٹ اور اس کی ہنسی..... اس دوپہر کی کوئی اور بات کوشش کے باوجود یاد نہیں آتی کہ وہ دن کیسا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں بہت ساری چھوٹی بڑی لڑکیاں، رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے، بے حد اہتمام کے ساتھ خوش ہوتی ہوئی، یہ تو یاد ہیں۔ ان کا وہ تفریح بھرا غل غپاڑا بھی یاد ہے کہ اس وقت معلوم ہوا تھا کہ ہجوم کی خوشی بھی چھوت کی بیماری کی طرح اڑ کر لگتی ہے۔ ایک دھندلی سی یاد تو ہے کہ لڑکیوں نے چھوٹی چھوٹی دکانیں اور اسٹال سجائے ہوئے تھے جن میں ان کی اپنی تیار کی ہوئی چیزیں مول بک رہی تھیں۔ لیکن تفصیل کے ساتھ وہی ایک اسٹال یاد ہے۔ اس میں سلائی کڑھائی کی چیزیں تھیں۔ دست کاری کے نمونے اور گڑیاں۔ یہ ساری کی ساری محنت نویں دسویں جماعت کی لڑکیوں نے کی تھی۔ ان سب چیزوں کی

www.taemeernews.com

فروخت سے اسکول کے لیے پنکھے یا واٹر کولر یا اس قسم کی کوئی اور ضروری تعیش کی چیزیں خریدی جاتی تھیں۔ اب بہت دن کی بات ہو گئی۔ حیرت تو یہ ہے کہ مینا بازار کا جو خاص "آئٹم" تھا، جس کی تیاری پر لڑکیوں نے خاصا وقت صرف کیا تھا، وہ بھی ذہن سے مٹ گیا۔ بعد میں، اس دن کھینچی جانے والی تصویروں کو دیکھ کر کچھ یاد آیا کہ اس دن بھیس بدلنے کا مقابلہ بھی ہوا تھا جس کی تیاری میں لڑکیوں نے خوب ہی سرگرمی دکھائی تھی۔ اور جس کا نام "فینسی ڈریس شو" میں نے بڑی مشکل سے اپنی زبان پر چڑھایا تھا۔ اس میں جس لڑکی کو انعام ملا تھا اس نے خون پینے والی ڈائن کا روپ دھارا تھا۔ اس نے اپنے سیاہ، چمکتے بال کمر تک کھولے ہوئے تھے، ہونٹ لال لال رنگ لیے تھے اور چہرے کو سیاہی سے پوت لیا تھا۔ اس نے اپنے نوکیلے دانت لہسن کے جوے رکھ کر بنائے تھے، امی نے مجھے بعد میں بتایا تھا۔ (لہسن کے جوے جو تاگا باندھ کر میرے گلے میں بھی لٹکائے جاتے تھے۔ کیوں، یہ اب یاد نہیں رہا)۔ اور میں نے ہمیشہ کی طرح یہ غیر ضروری تفصیل بھی ذہن میں محفوظ کرلی تھی۔ مجھے وہ لڑکی بھی یاد نہیں ..... حالاں کہ اس وقت اس نے بڑا گہرا تاثر مرتب کیا تھا ..... جو کاجل کی مونچھیں بنا کر لڑکا بنی تھی، اور شرارت کے مارے سب لڑکیوں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ہنس رہی تھی۔ اور اس کی دیدہ دیری پر سب لڑکیاں دانتوں تلے انگلیاں داب رہی تھیں۔ ہنسی تو بس اس کیا یاد ہے وہ اسٹال میں کھڑی ہوئی تھی۔ میں اب بھی اسے وہاں کھڑے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ رہی وہ۔ دروازے کے عین سامنے، ناممکن ہے کہ کوئی دروازے میں داخل ہو اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کی پکڑ میں نہ آ جائے۔ مسکرا رہی تھی وہ جب میں داخل ہوا تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ پھر ہونٹ لرزے۔ خم ہوئے، ذرا سا جھکے۔ اجلے دانت ایک کوندے کی طرح لپکے، پھر ہونٹوں میں چھپ گئے، پھر کوندا، متواتر لپک اور ہنسی کا دھیما ترنم جو آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے ایک بھرپور نسوانی قہقہے میں تبدیل ہو گیا۔ بدن کی گہرائیوں سے نکلا ہوا، کورے برتن کی طرح بجتا ہوا قہقہہ، زندگی اور شباب سے چھلکتا ہوا۔ گرم خون کی طرح زندہ، اشرفیوں کی طرح کھنکھناتا ہوا قہقہہ۔ کمرے کے اتنے حصے کو بھر دیا اس قہقہے نے اور اپنے مآخذ کو ..... ایک نوجوان، آزاد، صحت مند اور خوش باش لڑکی ..... اس اس طرح نمایاں کر دیا اس قہقہے نے کہ جتنے لوگوں نے سنا مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔ بڑا فطری قہقہہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سرکش بھی۔ غضب خدا کا، جوان لڑکی اور اونچی آواز سے ہنسی! ان کی حیرت میں ناپسندیدگی تھی۔ میں نے جھینپ کر امی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کیا اس قہقہے کا رخ میری جانب تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے ہاتھ سے امی کی قمیض کا دامن پکڑ کر اپنا منہ اس میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس قہقہے کی واضح، ٹھوس جسمیت کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی گردن کا اجلا گوشت اوپر نیچے

www.taemeernews.com

ہورہا تھا۔ اس کی قمیض میں کسا کسایا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ ہنسی کی ہر جنبش کے ساتھ بے تحاشا لرزا ٹھتا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ سیدھے چلو۔" امی نے مجھے الگ کر دیا۔ ان کی یہی عادت تھی، میں نے تلخی کے ساتھ سوچا ہوگا کہ جس وقت ان کی پناہ اور سہارے کی ضرورت ہوتی وہ مجھے بے یقینی کے سامنے کر دیتیں۔

یہ غصہ تو بعد میں آیا، اس وقت تو میری الجھن ہی دوسری تھی۔ اس کی ہنسی سے میرے روئیں روئیں میں گدگدی ہو رہی تھی۔ ایک چکنا، ہموار لمس میرے سارے بدن پر پھرا جا رہا تھا۔ کچھ مانوس سا، کچھ نیا سا، ایک لذت بھرے خوف کو بیدار کرتا ہوا۔ اگر میں نے اس کو فوراً نہیں روکا تو پھر یہ قابو سے باہر ہو جائے گا۔ میں نے جلدی سے اپنا نیکر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ٹانگوں کے بیچ میں نمی سی آنے لگی تھی۔

ان کو کسی طرح یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ان کے قہقہے اور زیادہ نکیلے ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی مجھے ان سب کی طرح چھیڑیں گے اور چڑائیں گے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے اندھیرے میں وہ سب پھر آن دھمکے، مجھے اذیت دینے والے۔ میرے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے اور مجھے چڑانے کے لیے بلند آواز سے جاپ کرتے ہوئے، آٹے کی آپا، آٹے کی آپا.....

اس نام سے بچنے کے لیے میں نے ہر وہ بات کی تھی جس کا انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نام ان کو بھی پتا چل جائے اور یہ بھی مذاق اڑانے لگیں۔ پھر تو میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔

میں وہیں رک گیا۔ اس کی ہنسی سارے کمرے میں بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ اب میرے لیے اس میں ان کی بازگشت بھی شامل تھی، مذاق اڑاتی ہوئی، تصحیک کرتی ہوئی..... جیسے میں لکڑی کے تختے سے بندھا کھڑا تھا اور وہ چابک دست بازی گر کی طرح میرے چاروں طرف اپنی چمکتی ہوئی ہنسی کے خنجر اچھال رہی تھی۔ میرے سر کا ایک بال بھی چھوئے بغیر خنجروں نے لکڑی کے تختے پر میرے جسم کے گرد حلقہ بنا دیا تھا۔ مجھے زخم نہیں آیا تھا لیکن میں ڈر کے مارے حرکت بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔

میرا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر چکا تھا۔ میں برف بن گیا تھا۔ اور اگر وہ ہنستے ہنستے مجھ سے بول نہ پڑتی تو میں زندگی بھر نہ پگھلتا۔

بہت دھیمے لہجے میں..... جیسے اپنی آواز سے مجھے سہلا رہی ہو..... اس نے پوچھا تھا کہ کیا لو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سوال سے پہلے اس نے مجھے امی سے فرمائش کرتے ہوئے سن لیا ہو۔

اس کے سوالوں نے میری آرزو کو ایک نیا حوصلہ بخشا میں نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے کیا

www.taemeernews.com

چاہیے۔ میں نے اپنی گہری خواہش کو بے نقاب کر دیا اس کے سامنے۔

وہ ہنسی تھی اور اس کی شوخ آنکھوں کا چنچل پن جیسے چبھنے لگا تھا۔ "گڑیا سے تم کھیلو گے؟" اس نے پوچھا تھا۔

اس کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس کا مطلب کیا تھا؟ اعتماد بھرا اپنا پن یا مجھ کو یہ باور کرا دینا کہ میرا رویہ مضحکہ خیز ہے۔ یہ ہمدردی تھی یا استہزاء؟

اس سے پہلے کہ سارا معاملہ ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح بے تکا اور مہمل ہو جائے، میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا: "اپنی بہن کو لے جا کر دوں گا۔"

اس پر وہ اور بھی ہنسی۔ جھرنے کی طرح جھرتی ہوئی ہنسی۔

اب میں حیران ہوتا ہوں کہ میں نے عین موقعے پر کس سادگی سے جھوٹ بول دیا تھا۔ حالاں کہ میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ مگر یہ جھوٹ میرے وجود کی ان گہرائیوں سے آیا تھا جہاں سے اکثر سچ ہی برآمد ہوتا ہے۔ یہ گہرائی نئی نہیں تھی۔ اپنی اصل کیفیت کو دوسروں سے خفیہ رکھ کر اس جذبے کی پرورش کرنا، خیالوں میں شدت کے ساتھ محسوس کرنا اور چیزوں کو اس طرح تصور کرنا جیسے وہ آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہوں..... یہ تھا میرا بچپن۔ کوئی اس پر ہنسے تو ہنستا رہے، میں اس کی خاطر اپنے آپ کو بدل تو سکتا نہیں۔ اور وہ گڑیا ان ہی کیفیات سے ہمکلام ہوتی تھی۔ ان کی علامت معلوم ہوتی تھی۔ اسی لیے مجھ پر اس کو حاصل کرنا لازم تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو میری طلب کی شدت کا اندازہ ہو (ورنہ وہ اسی شدت کے ساتھ میرا مذاق اڑائیں گے)۔ شاید اس لڑکی نے اس کھیل اور اس خواہش کا سراغ لگا لیا تھا، اور وہ جانتی تھی کہ اپنے سوا میری کوئی بہن نہیں ہے۔ شاید اس کی ہنسی کا سبب یہی تھا۔

اور امی؟ انہوں نے کیا سمجھا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ گڑیوں کا کھیل بھی ان عجیب باتوں میں سے ایک ہے جنہیں اب وہ میرا معمول سمجھ کر خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ انہوں نے برداشت کرنا اور قبول کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے میں جب نمائش سے لوٹا تو گڑیا میرے بغل میں تھی۔ گڑیا کو حاصل کر لینے کے بعد مجھے اس بات کی پرواہ بھی نہیں تھی کہ میں اسکول کا بھید معلوم کیے بغیر لوٹ آیا ہوں۔ میں نے جو مانگا تھا اس سے زیادہ مل گیا تھا۔

اگلا دن آنسوؤں کے بغیر طلوع ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سکون کے ساتھ سوچتے ہوئے پایا کہ اب امی جانے والی ہیں، اب میں گڑیا کے ساتھ کھیلنے کے لیے اکیلا ہوں گا۔ (اب میں جانتا ہوں کہ ان کے چلے جانے پر ڈراؤنے اکیلے پن کے بجائے اطمینان محسوس کرنے کے اسی لمحے میرے بچپن کی موت واقع ہوئی تھی)۔ اس دن میں نے آٹے کی گائے نہیں بنائی۔ اس دن میں نے دال کھا، چاول کھا والی کہانی سننے کی فرمائش بھی نہیں کی۔ اب میرے ہاتھ ایک نیا

www.taemeernews.com

مشغلہ آگیا تھا۔ یہ گڑیا وہ سب کچھ بن سکتی تھی جو میں چاہتا تھا۔ اور یہ محفوظ تھی۔ اسے کوئی نہیں کھائے گا۔ اس کا پورا ایک جسم تھا اور اس کی واضح شکل تھی کہ جسے بے وضع آٹے سے گھڑنا نہیں پڑے گا۔ بلکہ یہ تو تقریباً انسان ہی تھی ..... جیتی جاگتی مورت۔ زندگی سے بہت قریب۔ (اور جو کسر رہ گئی تھی، اس کو پورا کرنا میرے لیے کون سا مشکل تھا)۔ گائے تو زیادہ دور تک لے جائی نہیں جا سکتی تھی، یہ چل پھر کر وہ سارے واقعات جیے گی جو میرے دماغ میں بادلی ہنڈیا کی طرح کھد بد پک رہے تھے۔ یہ اس خفیہ، نامعلوم زندگی کو جیے گی جس کی بے تابانہ جھلک میرے حواس میں مچل رہی تھی۔ اب میں بہت سارے لوگوں کا کھیل، کھیل سکتا ہوں اور ان کی بہت ساری باتوں کا۔ یہ چڑیا بھی بن سکتی ہے اور امی بھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ سب سے پہلے تو یہ وہی لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ بھی وہی ہونا تھا جو اس لڑکی کے ساتھ ہوا تھا۔

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری گڑیا اتنی مخالفت کا باعث بنے گی۔ لوگ اتنے شدید ردعمل کا مظاہرہ کریں گے۔ (کیا وہ اپنی پسند کے کھیل کے انتخاب کو بھی میرے خلاف شہادت کے طور پر استعمال کریں گے؟)۔ انہوں نے بہت مذاق اڑایا، ہمیشہ کی طرح۔ اور ہمیشہ کی طرح ان کی اس سفاکی پر میں چپکے سے رو دیا۔

وہ میرے چوگرد جمع ہو گئے جب میں بہت فتح مندی کے ساتھ گڑیا کو بغل میں دبائے، امی کی انگلی پکڑے گھر میں داخل ہوا۔

"آٹے کی آپا....." کسی نے ہانک لگائی۔

ان کے استہزاء کی شدت نے جیسے مجھے سن کر دیا۔

"ارے دیکھو، آٹے کی آپا گڑیا لے کر آئی ہیں ..... گڑیا؟ ہاں، ہاں گڑیا..... آٹے کی آپا اب گڑیوں سے کھیلیں گی ....." اذیت دینے والوں کا کورس اب ناقدانہ نظروں سے میری ایک ایک حرکت، اتنے اتنے سے ردعمل کا جائزہ لے رہا تھا۔

میں اپنے لیے ان کی ناپسندیدگی کو، اور مذاق کے لہجے میں پنہاں، بتدریج بڑھتی ہوئی سرد مہر اور خشم ناک نامنظوری کو محسوس کرتے ہوئے، گھبرا کر جلدی جلدی تھوک نگل رہا تھا۔ میری آنکھوں میں کھٹک ہونے لگتی تھی۔ ٹانگوں کے بیچ میں گیلا پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔

وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے ..... اور اس نفرت میں حق بجانب بھی تھے ..... کہ میں کہنا ماننے والے اور تمیز دار بچے کا نمونہ تھا جو آنے جانے والے مہمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح میں امی کے کہنے پر انگریزی کی نظمیں اور پہاڑے سنا کر سب کی شاباشی وصول کرتا تھا۔ اس سوانگ سے مجھے بھی نفرت تھی۔ لیکن بے چون و چرا اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے استعمال ہونے دیتا تھا تاکہ آنے والے کو میرے اعصاب زدہ بے تکے پن کا پتہ

www.taemeernews.com

نہ چلے، اس سہم کا اندازہ نہ ہو جو میری گہرائیوں میں بیٹھ گیا تھا۔ یہ فرفر سبق یاد کرنا اپنے بونگے پن کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے تھا۔ میں خود بھی نفرت کرتا تھا اس روپ سے اور نفرت کیے جانے کی لائق سمجھتا تھا۔ لیکن میں کیا کرتا۔ میں بڑوں کا اطاعت گزار بھی تو تھا، اور شاباشی ملنے پر ایک جھوٹی خوشی کی تسلی کو پسند بھی کرتا تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ لوگ بھی مجھے اپنے ساتھ قبول کریں، نفرت نہیں کریں۔ میں ان کے کھیلوں میں شامل ہونا چاہتا تھا، لیکن نشانہ ہی بن کر رہ جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ہمیشہ کی طرح، میں کتے کے اس زخمی پلے کی صورت اختیار کر گیا جس کی معذوری معصوم بچوں میں بھی ایک سفاکانہ شرارت کی اکساہٹ پیدا کرتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا بے ڈھنگا پن بھی لوگوں کی خفتہ درندگی کو بیدار کر دیتا ہے اور وہ مجھے مبتلائے آزار کر کے لذت بھری تسکین محسوس کرتے ہیں۔ خاص طور پر اجی۔ جس کی دھونس کا میں مستقل ہدف تھا۔ (اتنے برسوں کے بعد بھی میں اس بات کو اس کے خلاف فرد جرم بنائے بیٹھا ہوں۔ اس نے جو کچھ کیا، وہ اس صحت مند آدمی کا ردعمل تھا جو سڑک کے کنارے پڑے ہوئے، سسکتے، بھک منگے کو جاتے جاتے ایک ٹھوکر مار جاتا ہے۔)

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، اس نے زور کا دھکا دیا اور میں فرش پر آن گرا۔ میرا گھٹنا چھل گیا۔ میری ٹانگوں میں کچے فرش کے کنکر چبھ گئے۔ مجھے کتنی چوٹ لگی ہوگی! اپنی تکلیف کا خود ہی احساس کر کے میں رونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے پاس سے کوئی چیز کم ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کیا چیز نہیں ہے۔۔۔ میری گڑیا اتنی قیمتی گڑیا جسے میں نے بڑے جوکھم کے بعد حاصل کیا تھا..... محرومی کا احساس فوارے کی طرح ابلا جیسے کسی نے میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہو یا میری آنکھ نوچ ڈالی ہو۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور میرا ننھا سا دل دھڑکنا بھول گیا۔ تب میں نے اسے دوبارہ دیکھا۔ اپنی اس گڑیا کو وہ اجی کے پاس تھی۔ وہ اجی کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ اسے نوچ رہا تھا، اچھال رہا تھا، پھینک رہا تھا۔ وہ اس پر ہنس رہا تھا۔

اپنی گڑیا کو اجی کے پاس دیکھ کر میرا خون رقابت کے جذبے سے کھولنے لگا۔ اور یہ میری برداشت سے باہر بھی تھا۔ میں اپنی گڑیا کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے پوری آواز سے چیخ ماری اور اپنے آپ کو دوبارہ فرش پر گرا دیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور سر زمین پر لوٹ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ٹانگوں کے بیچ میں سے بھی۔ میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور مسلسل سسکیوں کی وجہ سے سانس رک رہا تھا۔ ہچکی تھی کہ بند ہونے کا نام نہیں لیتی تھی..... وہ میری گڑیا کے ساتھ بھی وہی کرے گا۔ میری گڑیا کو تکلیف ہو گی۔ وہ میری گڑیا کو..... امی نے آکر مجھے فرش سے اٹھایا جسے میں نے گیلا کر دیا تھا۔ انہوں نے

www.taemeernews.com

پیٹھ پر دو تین دھموکے مارے تو سانس بحال ہوا۔ امی نے اجی کے قبضے سے گڑیا زبردستی چھین کر دوبارہ میرے ہاتھوں میں ٹھونس دی۔ میں نے ہتھیلیوں سے آنسو پونچھے اور گڑیا کے کپڑوں پر سے اجی کی انگلیوں کے مٹی بھرے نشان صاف کر کے گڑیا کو دوبارہ اپنے لمس سے روشناس کرنا شروع کیا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ گڑیا کا جسم وہی تھا جس سے میں نے دوستی کی ابتداء کی تھی۔ وہ اب بھی میری اپنی تھی۔ مجھے تسلی ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ امی کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں اور آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں۔

میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کے گالوں پر پپی کرنے لگا۔ میری وجہ سے ان کو دکھ ہوا ہے ناں۔ میں اب ان کو پپی کروں گا تو وہ ہنسنے لگیں گی۔ لیکن وہ ہنسی ہی نہیں۔ ان کے ماتھے کی لکیریں جیسے پختہ ہو گئی تھیں۔

اور وہ سب ایک حقارت آمیز توجہ کے ساتھ دیکھتے ہی رہے۔ "خود تو بچو کچھ کر نہیں سکتے، جا کے چغلی لگادی امی کے لاڈلے نے..... چغلخور، چغل خور کے ہاتھ میں بیڑا منہ میں کیڑا، رونو منہ دھونو، متوڑے پیا، آئے کی آپا....."

حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ان سب باتوں سے مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ میری گڑیا جو تھی میرے پاس، تسلی دینے کے لیے۔ وہ مجھے ڈھارس دلا سکتی تھی، میری تنہائی کو باتوں اور کھیلوں سے بھر سکتی تھی۔ اب مجھے کھیلنے کے لیے اجی کا منہ دیکھنے اور اس کی ذرا سی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے آگے بلکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب اس کا دل نہیں چاہتا تھا تو وہ مجھ سے یوں بات کرتا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ اور اس کے کھیل میں دھکے بھی لگتے اور چوٹیں بھی۔ اب تک میں یہ سب سہنے کے لیے مجبور تھا۔ اب گڑیا نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔

لیکن پھر بھی کوئی چیز اجی کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ میں اس کے ارد گرد منڈلایا کرتا تھا اور جو اس کو کرتے ہوئے دیکھتا، خود بھی وہی کرنے کی کوشش کرتا۔ کس قدر انہماک سے، ان میں ڈوب کر میں وہ کھیل کھیلا کرتا جو اجی نے سکھلائے تھے کہ ان کی تمام کیفیت اب بھی میرے حافظے میں زندہ ہے۔ بلکہ زندگی کا یہ کبھی نہ بھلایا جانے والا سبق بھی تو اجی سے ملا تھا کہ کھیل کس طرح پوری سنجیدگی سے کھیلنا چاہیے جیسے کھیل نقل نہیں ہے، زندگی ہے!

اجی کے ساتھ کھیلے ہوئے کھیل اپنے عمل میں اس طرح ملوث کر لیتے تھے کہ ان کے دوران ایک ہرے بھرے رسیلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ میں اس کیفیت کو نام تو نہیں دے سکتا، پہچان سکتا ہوں۔ یہ عین مین وہی کیفیت تھی جو اجی کے ساتھ لٹو پھرانے میں ہوتی تھی۔ وہ رسی لٹو کے گرد لپیٹ کر لٹو زور سے اچھالتا۔ رسی کھلتی جاتی اور لٹو گھومتا رہتا۔ پھر وہ گھومتا ہوا لٹو اپنی ہتھیلی پر اٹھا لیتا، جہاں لٹو اسی روانی سے گھومتا رہتا۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی کتنی بار

www.taemeernews.com

کوشش کی تھی۔ ہتھیلی پر لٹو کی گھومتی ہوئی نوک سے کن من ہونے لگتی جو سرسرا کر سارے بدن میں گدگداہٹیں پھیلا دیتی (بالکل یہی کیفیت!) اور لگتا کہ خوشی سے اچھلتا ہوا دل بھی اسی طرح ایک نوک پر اپنی حرکت میں ست کھڑا ہے۔ لیکن جلد ہی اس رفتار کا آہنگ ٹوٹ جاتا اور لٹو میرے ہاتھ سے گر جاتا۔ اس کیفیت پر میں رو پڑتا تھا۔ ایسا اجی کے ساتھ کبھی نہیں ہوا۔ اسے چیزوں کو حرکت میں لانا اور ان کے آہنگ کو برقرار رکھنا آتا تھا۔ مجھے نہیں۔ اسی لیے تو میں اس کی طرف دیکھتا تھا اور وہ مجھ سے حقارت کا برتاؤ کرتا تھا۔ ہم اور بھی کھیل کھیلتے تھے۔ ہم بڑے سے تسلے میں پانی بھر کر ٹین کا بنا ہوا اسٹیمر اس میں چھوڑ دیتے تھے، جس کے بھدے، ادھ بنے، قلعی شدہ عرشے پر موم بتی جلائی جاتی تھی تو وہ پٹر پٹر کرتا، پانی کو کاٹتا ہوا گھومتا تھا۔ اجی چھان پر چڑھ کر تسلہ اتارتا، میں اس میں پانی بھرتا اور جہاز کو پکڑے رکھتا جتنی دیر وہ موم بتی کو ماچس دکھاتا..... وہ ماچس جلا سکتا تھا، میں نہیں۔ وہ پیڑوں پر نگاہ رکھتا اور جب پپیتے کے پتے کناروں سے پیلے پڑنے لگتے تو اچک کر پتے کی نوک پکڑ لیتا اور شاخ برابر پتا توڑ لیتا۔ پھر میں اس میں سے پتے والا ہرا حصہ بڑی باریکی سے چن کر الگ نوچ دیتا اور خالی ڈنڈی کو پانی میں بھگو دیا جاتا۔ دوپہر کو سب کے سو جانے کے وقت ہم چپکے چپکے باہر جاتے اور گل عباسی کے بیج توڑ کر لاتے، کالی مرچ جیسے، اور اس احتیاط سے کہ کسی کی نظر نہ پڑے، اپنے منہ میں بھر لیتے۔ پھر پپیتے کے ڈنڈی کے سرے پر منہ رکھ کر بیج اگلتے اور پھونک مارتے تو ڈنڈی کے درمیانی، پھسلواں خلا میں تیزی سے لڑھکتے جاتے۔ اجی ان بیجوں میں اکثر پن بھی چبھو دیا کرتا تھا (پتہ نہیں کیوں، اس کو چبھونے کی اتنی عادت کیوں تھی) اور وہ پن لگا ہوا بیج گرتا پڑتا، پھسلتا چلا جاتا، اور اس میں لگا ہوا پن ایک چمکیلی جھلک کے سوا نظر نہ آتا..... ان مل، بے جوڑ چیزوں کا اس مزے سے مل جانا اور درمیانی خلا کے پھسلواں راستے میں تیز رفتاری سے گزار دیے جانا، اجی ان چیزوں پر کیسی مہارت رکھتا تھا۔ ایسے میں اس کے کان کی لویں سرخ ہو جاتیں، اور چہرہ انہماک کی شدت سے ایسا ہو جاتا جیسے چٹان میں سے کاٹ کر بنایا گیا ہو۔ اور اس کا ساتھ دینے کی اپنی سی تو میں بھی کرتا تھا۔

سمندر بناتے تھے اور مچھلیاں بھی پکڑتے تھے ہم۔ صحن کا ایک حصہ کچا تھا اس میں مٹی جمع کر کے حوض بناتے اور اس حوض میں پانی لا لا کر بھرتے۔ "اب اس میں مچھلیوں کا شکار کریں" اجی مجھ سے کہتا..... ہر کھیل میں خود بخود ایسا ہوتا کہ وہ ہدایات جاری کرنے والا بن جاتا اور میں حکم بجا لانے والا، اور اسی کے کہنے پر میں بستر کے گدوں میں سے روئی نکال کر اس طرح پتلا پتلا بٹ لیتا اور لے جا کر پانی میں ڈال دیتا۔ پھر سیفٹی پن میں دھاگا باندھ کر اس کانٹے سے پانی کی تہہ میں بیٹھ جانے والی روئی کی مچھلیاں پکڑا کرتے۔ آخر میں ہوتا یہ تھا کہ زیادہ مچھلیاں اجی کے

www.taemeernews.com

کانٹے میں پھنسی ہوتیں، اور میرے ذمے ریت کے اس حوض کو ڈھا کر صحن کی زمین کو صاف کرنا رہ جاتا، جہاں گیلی مٹی پانی پی کر بھر بھرانے لگتی۔ میرے ہاتھ میں کیچڑ رہ جاتی اور امی کی ڈانٹ کہ "لے کے بغارے ڈال دیے ہیں گدوں میں"۔

اجی نے مجھے طلب کیا۔ "یہ پن مرغی کی آنکھ میں ڈالیں گے اور اس کی آنکھ کا موتی نکالیں گے۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔" میں نے کڑکڑاتے ہوئے مرغے کو کپڑا ڈال کر پکڑا اور اجی کے حوالے کر دیا۔ وہ اس کی تنی ہوئی، سرخ کلغی سے کھیلتا رہا اور مرغ نے آنکھ جھپکی تو اس میں پن چبھو کر باہر کھینچ لیا۔۔۔۔ وہ چکنی مٹی کے گولے بنا کر چھجے کے نیچے گزرنے والوں پر بھی گراتا تھا۔ یہ بھی میں نے کبھی نہیں کیا۔ اس کے لیے مجھے ٹوک دیا گیا تھا کہ "اچھے بچے ایسے نہیں کرتے۔ تم تو اچھے بچے ہو"۔ اجی کو اس منع کیے جانے کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ میرے اس دبوپن کا خوب مذاق اڑاتا کہ میں وہ کام کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس کے لیے ایک بار منع کر دیا گیا تھا۔ "ایسے نہیں کرو، انہوں نے منع کیا ہے" میں اس کو روکتا تو وہ ہنس پڑتا او میرا مذاق اڑاتا "آٹے کی آپا۔" میں اس کی دوستی سے معزول ہو کر پھر بوا کے چولہے کے پاس لوٹ آتا اور پیڑھی کھینچ کر آٹے کی گائے بنانے لگتا..... اب تو میں بھی سمجھ گیا تھا کہ مجھے اس نام سے کیوں پکارا جاتا ہے..... اور یہ کہ میں اس وقت تک آٹے کی گائے سے کھیلنے کا پابند رہوں گا جب تک کہ اجی کو کسی دوسرے کھیل کے لیے میری ضرورت نہ پڑ جائے۔ مثلاً ہوا میں پھرکیاں اڑانے والا کھیل۔ وہ بڑی پھرتی سے سگریٹ کے ڈبوں کو گول گول گھماتا تھا بیچ میں سے پچکا کر، پھر اسے اس طرح کاٹ لیتا کہ وہ پھرکی بن جاتی۔ پھر کون کا ڈھیر میرے ہاتھ میں تھا کہ وہ دور چلا جاتا۔ موڑ والے پیلے مکان سے بھی آگے۔ جہاں میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا، صرف سوچ سکتا تھا کہ وہ وہیں کہیں ہے، میرے انتظار میں۔ گھر کے برآمدے میں ہوا کے رخ اور اس کی سمت منہ کر کے پھرکیوں کو ہوا کے حوالے کر دیتا اور انہیں گول گول لڑھکتے ہوئے، بھاگتے، اڑتے ہوئے دیکھتا رہتا، یہاں تک کہ اجی، پسینے پسینے ہوا اور فاتحانہ شان کے ساتھ، ای موڑ کے پیچھے سے نمودار ہوتا، پھرکیوں کو ہاتھوں سے مسلتا ہوا: اور مجھے بتاتا کہ آج تینوں پھرکیاں واپس آگئیں۔ پھرکیاں بھی اس کے پاس لوٹ آتی تھیں۔ میں تو صرف انہیں اس کی سمت روانہ کر سکتا تھا۔

اس دن اجی نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی۔ میں گڑیا والی لڑائی بھول چکا تھا۔ اس نے دو غباروں کے درمیان دھاگا باندھ کر ایک غبارہ میرے کان پر رکھ دیا تھا اور اپنے غبارے سمیت دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ "دال کھا، چاول کھا کھیلو گے؟" اس نے اپنے غبارے پر منہ رکھ کر کہا۔ میرے کان کے غبارے میں جھنجناہٹ ہوئی، آواز بالکل صاف تھی۔ اسے یہ کہانی میں

www.taemeernews.com

نے سنائی تھی۔ بتانا تو میں اسے آٹے کی گائے کے بارے میں بھی چاہتا تھا، اس موہوم سی امید پر کہ وہ گائے کی روٹی کھانا چھوڑ دے اور مجھے اس اذیت رسانی کو دیکھنے کے عذاب سے نجات دلادے، لیکن یہ سوچ کر ڈر گیا کہ وہ مذاق اڑائے گا اور اب سچ مچ کی آٹے کی آپا کہے گا۔ اس لیے میں نے اسے صرف اس کہانی میں اپنی شرکت کے بارے میں بتایا تھا، اور اپنے اس احساس زیاں کے بارے میں کہ میں کیوں اس سانپ کو پکڑ کر رکابی سے کھلا نہیں سکا، اس بچے کی طرح، اور اس کو تھام کر گرفت میں لے آنے کے لمس سے محروم رہ گیا۔

"تم دال کھا، چاول کھا ہو اور میں تمہیں کاٹنے آرہا ہوں" اس نے کہا۔ ہر کھیل میں ہمارے کردار وہی متعین کیا کرتا تھا۔ اور میں وہی کرتا جس کی وہ تاکید کرتا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور چاروں ہاتھ پیروں پر رینگ رینگ کر میری طرف آنے لگا۔ وہ اپنے حلق سے دھیمی دھیمی غراہٹ کی آواز بھی نکال رہا تھا ..... جیسا کہ اس کی دانست میں ایک رینگنے والے ڈراؤنے جانور کو نکالنی چاہیئے ..... اور اس کی آنکھیں ایک نامانوس وحشت خیز چمک لیے ہوئے تھیں کہ میں ان کی جانب سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ یہ چمک مجھے کسی چیز کی تعمیل کے لیے حکم دے رہی تھی۔ لیکن کیا چیز؟ مجھے ان کی قوت میں آکر کیا کرنا چاہیئے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سوائے اس پرانے دستور کے، کہ اس نے مجھے کھیل میں شریک کیا ہے تو مجھے اس کے اعتماد پر پورا اترنا چاہیئے۔

وہ میرے بالکل پاس آکر رک گیا۔ اس کا سانس اکھڑا اکھڑا تھا۔ وہ چاروں ہاتھ پیروں پر کھڑا تھا۔ اس گائے کی طرح، میں نے سوچا، جو میں آٹے سے بناتا ہوں۔ بس صرف یہ کہ اجّی آٹے کا تھوڑی ہے وہ تو گھاس میں رینگنے والا اور پھن کاڑھ کر ڈس لینے والا سانپ ہے۔ مجھے سانپ پکڑنا ہے۔ میں بھی اس کو دال چاول کھلاؤں گا۔ میں بھی اتنا ہی بہادر ہوں۔ ایک بار میرے ہاتھ تو آجائے ..... اور یہ رہا، وہی سرسراہٹ ہوئی اور اس نے رینگنا شروع کیا۔ ایک بے حد معمولی سی جنبش، جس کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن جس کی جسمیت کو دیکھا نہیں جاسکتا، آس پاس کی چیزوں میں خفیف سی لرزش کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی یہاں تھا اور اب آگے بڑھ رہا ہے ..... اسی طرف آگے بڑھ رہا ہے، میری طرف بڑھتا آرہا ہے۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤں اور جھپٹا مار کر دبوچ لیں ..... یہ میری مٹھی میں آگیا، گرم، زندہ، دھڑکتا ہوا، کلبلاتا ہوا اور پھسل پڑنے کو تیار ..... یہی تو تھا، اب ہاتھ آگیا ..... لیکن اب اسے کھلاؤں کیونکر؟ مجھے ادھیڑبن میں مبتلا دیکھ کر اجّی نے بتایا۔ سانپ کے ساتھ وہ بھی تو کھنچا آرہا تھا۔

"ایسے کرو" اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر فرش پر لٹا دیا۔ "سانپ کو یوں ہی مٹھی میں پکڑے رہو۔ پھر اس کو منہ میں لے جاؤ اور دل میں کہو دال کھا۔ پھر یہاں لگاؤ اور کہو چاول کھا

www.taemeernews.com

....."ہاں، اسی طرح کیے جاؤ۔ سانپ کو چھوڑنا مت، ورنہ ہاتھ سے نکل بھاگے گا....."

سانپ کو میں چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری مٹھی میں سما نہیں رہا تھا۔ اس کا ہموار لمس میری ہتھیلی کو کیسا زندہ محسوس ہو رہا تھا۔ میری جلد سے اپنا سر مس کرتے ہوئے پالتو جانور کی طرح، نرم اور بہت سخت ..... اور حالاں کہ وہ اپنا زہر بھی چھوڑنے لگا تھا..... جس کی وجہ سے بچے کی حیرانی کے باوجود دال کھا، چاول کھا والی رکابی دور پھینکوا دی گئی تھی ..... پھر بھی میں اسے چھوڑتا نہیں۔ اجّی کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز میں التجا تھی ..... پہلی دفعہ میرے لیے التجا! میں تو پاگل ہوا جا رہا تھا..... اور وہ کسی جاپ کی طرح دہرا رہا تھا: "دال کھا، چاول کھا، دال کھا، چاول کھا..... " میری آنکھیں بند تھیں، اور رواں رواں اس کی جسمیت کے تسکین بخش احساس سے سرشار ہو کر اس خوشی میں جھوم رہا تھا کہ اب اس میں اور مجھ میں یگانگت کا وہ سمبندھ ہو گیا ہے کہ وہ اب آٹے کی آپا والی بات بھول جائے گا، کہ امی کی چیخ سنائی دی۔ ہول سے بھری ہوئی، بدحواس چیخ۔ پھر ان کے ہاتھ کے زوردار دھکے نے چونکا دیا۔ وہ اجّی کی پیٹھ پر لگا تار طمانچے مار مار کر اسے الگ دھکیل رہی تھیں اور میرے منہ سے ٹپکتے ہوئے تھوک کے تار کو پونچھتی ہوئی، مجھے گود میں اٹھا کر لے گئیں۔ وہ کانپ رہی تھیں اور ان کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ میں نے امی کے کندھے سے سر اٹھا کر اجّی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک فرش پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ سیدھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ملامت تھی۔ وہ آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم نے دغا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان چبھتی ہوئی آنکھوں میں غداری کے الزام کی جگہ ایک سرد مہر اجنبیت آ گئی۔ بے گانگی سے بھی زیادہ ان میں حقارت اور استہزاء کی تحریر تھی: "تم اور کر بھی کیا سکتے تھے رہے ناں آٹے کی آپا، آٹے کی آپا...."۔ اس تضحیک کی تاب نہ لا کر میں نے اپنا منہ امی کے کندھے میں چھپا لیا۔

جس نظر سے میں بچ نہیں سکتا تھا، اس نظر میں فیصلے کی سی سختی تھی۔ منتقم نگاہوں میں ایسی سفاک درشتی کہ میرے سینے میں کھب کر گھاؤ ڈال دیں گی۔ وہ مجھ کو جتا رہی تھیں کہ میں نے اپنے آپ کو اعتبار کا اہل ثابت نہیں کیا، یہ ایک قسم کا امتحان تھا، اس میں کم زور ثابت ہوا۔ اس کی سزا مجھے عنقریب سنائی جائے گی۔ اگلی صبح مجھے بوا کے سپرد کیا گیا تو جیسے میں کوئی اچھوت ہوں یا کوڑھی۔ اور ساتھ ہی ان کو یہ تاکید کہ آپ کی نظروں سے ایک لمحے کے لیے اوجھل نہ ہو۔ بوا نے پیڑھی کھینچ کر مجھے چولہے کے پاس بٹھا لیا۔ آج ان کا چہرہ آگ میں چمکنے کے باوجود بجھا بجھا سا تھا۔ آج ان کے پاس میرے لیے کوئی کہانی نہیں تھی۔ دال کھا، چاول کھا والی بھی نہیں۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر، گندھے ہوئے آٹے کا لگن میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اس میں ذرا سا ٹکڑا اٹھا کر نیم دلی کے ساتھ اسے گائے کی شکل دینے لگا۔ گائے اپنی ٹانگوں پر کھڑی

www.taemeernews.com

بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اچانک مجھ یاد آیا کہ اب تو میرے پاس کھیل کا ساتھی موجود ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے اجّی کی، یا آٹے کے پیڑے توڑ کر گائے بنانے کی۔ میں اپنی گڑیا سے کھیلوں گا۔ میرا اجو جی چاہے گا گڑیا وہی بن جائے گی اور ساری کہانیاں کھیل کر دکھائے گی۔

آٹے کی کچی، ادھوری گائے کو ہاتھ مار کر گراتا ہوا میں اٹھا اور بوا کے روکتے روکتے تیر کی طرح سیدھا بستر کی طرف گیا جہاں اپنے تکیے پر میں نے گڑیا کو لٹایا تھا۔

بستر کی سفید چادر، سلوٹوں سے بالکل عاری، سپاٹ پڑی تھی۔ اجلی، کوری، کفن کی طرح، مگر خالی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے تکیہ الٹ کر دیکھا۔ گڑیا وہاں نہیں تھی۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ کہاں گئی میری گڑیا، کون لے گیا؟ میں نے دیوانہ وار ایک ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر ڈھونڈنا شروع کیا۔ بستر کے نیچے جھانکا، کپڑوں کی الماری میں دیکھا، امی کی کتابوں میں ٹٹولا، بوا کے صندوق اور بقچی کو بھی کھول کر دیکھا، کونا کونا چھان مارا۔ گڑیا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اس دن بوا سے روٹی بھی نہیں پکائی گئی۔ گڑیا کی تلاش میں انہیں تو اچولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرنا پڑا۔ پچھلے دن کی راکھ چولہے میں اڑتی رہی۔ میری آنکھ سے آنسو نہیں تھمتا تھا۔ "میری گڑیا کو کوئی پکڑ کر لے گیا"۔ امی جوں ہی اسکول سے گھر میں داخل ہوئیں، میں نے روتے روتے ان کا دامن تھام لیا۔ گڑیا کے غائب ہوجانے کا ذکر اپنی زبان سے کرتے ہوئے میری ہچکی بندھ گئی۔

امی نے کھانا نہیں کھایا، نہ ہاتھ منہ دھو کر آرام کیا۔ فوراً ہی گڑیا ڈھونڈنے میں جٹ گئیں۔

گڑیا ملی بھی سب سے پہلے انہی کو۔ گڑیا مل گئی تو انہوں نے اس کو مجھ سے چھپانا چاہا۔ وہ اسے مجھ کو دکھانا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے چادر سے ڈھانپ سکتیں، میں اسے دیکھ چکا تھا۔ ان کے دفاع میں، میں اتنا تو کہوں گا کہ انہوں نے مجھے اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش تو کی، لیکن جب ایک دفعہ میں نے گڑیا کی حالت کو دیکھ لیا تو اس منظر کو پھر میری نگاہوں سے کوئی مٹا نہیں سکتا تھا۔ وہ موری میں پھینک دی گئی تھی۔ استعمال شدہ چیز کی طرح۔ مگر بلاشبہ وہ میری گڑیا تھی۔ اسے مسخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی ننھی سی شلوار قمیض بری طرح نوچی گئی تھیں۔ اسے جگہ جگہ سے ادھیڑا گیا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں سے جھلکنے والے جسم پر جابجا نشان تھے۔ قمیص کا گریبان پھاڑ کر سامنے سے اسے بالکل ننگا کر دیا گیا تھا۔ کپڑے کے عریاں سینے پر دو گول نشان نظر آرہے تھے۔ نیلی روشنائی پر تھوک لگا کر بنائے جانے والے نشانوں کو قلم کی نب سے بار بار رگڑ کر گہرا کیا گیا تھا اور ان پر وہی اس دن والا زہر ابھی تک گیلا

www.taemeernews.com

تھا.....

میں نے اسے اٹھا لینا چاہا۔ لیکن مجھے روک دیا گیا۔ وہ وہیں پڑی رہی۔ کسی لڑکی کے بجائے ایک لاش کی طرح۔ وہ اس لڑکی کی طرح پڑی تھی جسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ میں مجرم نہیں ہوں۔ اس کی جسمانی شناخت پر اتنے اصرار میں ملوث ہونے کی وجہ سے میں قاتل تو نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری معصوم گڑیا کے ساتھ بھی یہ زیادتی ہو گی۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو ہنستی، کھلکھلاتی لڑکیوں کے صحت مند جسم، بار بار کچوکے دے کر قتل ہوتے ہوئے، میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ چمکتے ہوئے خنجر ان کے عریاں کر دیے جانے والے سینوں میں گھاؤ ڈالنے لگے اور ان میں سے ابلتے ہوئے گاڑھے گاڑھے خون سے گڑیا لتھڑ گئی۔ وہ سر سے تلے کر پیر تک خون سے بھر گئی۔ اور پھر وہ اٹھی۔ اس نے اپنے بدن سے خون پونچھا اور میرے چہرے پر ملنے لگی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے اسے یقین دلانا چاہا کہ میں بے قصور تھا۔ مگر اس کے خون بھرے ہاتھ میرے چہرے تک پہنچ چکے تھے۔

میں نے جلدی سے جا کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میں اس چہرے کو پہچان گیا تھا۔ اس دن پہلی بار میں نے نفرت کرنا سیکھا۔

اس لمحے میں نے جان لیا کہ میری سزا یہ ہے کہ میں تمام عمر ایسے بے تکے سوالوں کے عذاب میں مبتلا رہوں گا کہ اس میں آخر ہنسنے کی کیا بات تھی، کیوں ہنستے ہیں لوگ؟

۱۹۸۷،۱۹۸۸ء

OOOOO

www.taemeernews.com

اوپروالیاں

www.taemeernews.com

I dream of a language of knives and beaks, of reeds and flames. A language of whips.'

Octavio Paz

www.taemeernews.com

*

شام کا وقت بخار کا وقت تھا۔ اب یہ بچوں والی بات ہو کر رہ گئی تھی کہ شامیں وہ شامیں نہ رہی تھیں۔ ان کا سہانا پن رخصت ہو چکا تھا۔ یہ نہیں کہ چڑیوں کا بھرا مار کر اڑنا، پیڑ میں جمع ہو کر شور مچانا اور ٹھنڈی خنک چھاؤں کا پیڑ سے لپٹ کر زمین پر پھیلنا ختم ہو چکا تھا۔ یہ سب بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہر شام میں ایک سہم سوار تھا اور بیمار جسم کی گرمی۔ دروازے کے سامنے رکھے ہوئے پلنگ پر لیٹے لیٹے میں یہ سب جان گیا تھا کہ دیوار سے ڈھلتی ہوئی دھوپ کی ملگجاہٹ میں زردی گھنڈ جاتی ہے۔ میں اس رنگت کو بھی جانتا تھا۔ پرانے بیمار کے چہرے کا رنگ، اور گرم زمین جو چھونے سے اندر دبے ہوئے بخار کا پتہ دیتی تھی، اس کی تپش بڑھ کر کھولتی ہوئی، بھاری چادر کی طرح میرے گرد لپٹ جاتی اور مجھے بھینچنے لگتی۔ میرا سانس تیز ہو جاتا۔ آنکھیں جلنے لگتیں پاؤں کے تلووں سے جیسے آگ نکل رہی ہوتی۔ بخار چڑھی ہوئی شام کا نپنے، ہلہلانے لگتی۔ اس کی ہری بھری فصیلیں کھردری ہو کر آنکھوں کے پیچھے کہیں چبھنے لگتیں۔ میں اس اذیت سے گھبرا کر آنکھیں میچ لیتا۔ تکیے میں منہ چھپا لیتا۔ لیکن اس روگی شام سے کہیں پناہ نہ تھی۔ ہر چیز سرخ ہو کر سیاہ پڑنے لگتی۔ میں نڈھال ہو کر پڑ رہتا اور مجھے بعد میں بتایا گیا کہ بے حواس سا ہو جاتا یہاں تک کہ مجھ پر غشی طاری ہو جاتی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پھر شام ڈھلے، رات گئے کہیں میں ٹھکانے سے اپنے آپے میں آ پاتا۔

اس پیڑ نے بڑھنا بھی ایک ایسی ہی شام میں شروع کیا تھا۔ دروازہ پیڑ کے سامنے کھلتا تھا۔ دروازے کی سیدھ میں پلنگ تھا۔ ہوا کا جھونکا تیز ہوتا تو پیڑ کی ڈالیاں دروازے میں سے جھانکتیں، ٹھٹھکتیں اور یہ دیکھ کر کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں، سائے کی طرح دبے پاؤں پلنگ کی سمت بڑھنے لگتیں۔ میں نے پلنگ پر دم سادھے پڑے پڑے دیکھنا سیکھ لیا تھا۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کسی کو پکار سکوں۔ میری ذرا سی بھی جنبش پر بھی وہ چوکنا ہو جاتیں اور آگے بڑھ کر میرا گلا گھونٹ سکتی تھیں، تاکہ ان کا راز محفوظ رہے۔ ان کے آگے بڑھنے کے خیال سے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ اس شام بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ امی نے مجھے کانپتے، لرزتے ہوئے دیکھ لیا۔ "اس کا بخار پھر بڑھ رہا ہے" انہوں نے ابا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر اپنی کرسی سے اٹھ گئے ہوں گے اور چمڑے میں برف بھر کر اسے کوٹنے لگے ہوں گے، اس لیے کہ اس کا اگلا احساس جو میرے حافظے میں موجود ہے وہ یخ بستہ گیلے پن کا ہے۔ روئی اور رینگتی ہوئی ڈالیوں کی سرسراہٹ، میرے جلتے ہوئے پپوٹے، کنپٹی پر تیز دھمک سی ہوتی ہوئی اور پھر جیسے جلتے توے پر چھن سے پانی کی بوند پڑ جائے۔ امی برف میں بھگو کر میرے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ امی میں نے قیاس سے کہا ہے۔ اس لیے کہ بخار میں پھنکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھنا ممکن

www.taemeernews.com

نہیں تھا۔ کہ کون کیا ہے اور کہاں ہے۔ سوائے ان جھکتی، ٹھٹھکتی اور پھر رہ رہ کر بڑھتی ہوئی ڈالیوں کے، جن کے گرداب تپتا ہوا اور گہرا، گہرا اندھیرا لمبا لمبا لیٹنے لگا تھا۔ میں بس یہ پہچان سکتا تھا کہ ایک ہاتھ میری طرف اٹھتا ہے، پھر جلتے ہوئے ماتھے پر ایک ٹھنڈا یخ چھنا کا بجھنے لگتا ہے۔ جس سے سارے بدن میں ایسی جھرجھری دوڑ جاتی جو بخار سے بھی زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ اور کچھ دیر وہاں جمی رہتی ہے، کسی جانور کی زبان کی طرح مجھے چاٹتی ہوئی۔ کھردری، ٹھنڈی، گیلی، گندی۔ میں پھر کپکپانے لگتا۔ ذرا ذرا دیر کے بعد یہ لرزنا کانپنا مجھے اس قدر بے حال کر دیتا کہ پھر میں بار بار اُچٹ جانے والی کچی نیند میں ڈھیر ہو جاتا۔ جلتے ہوئے پپوٹے پوری طرح بند نہ ہونے پاتے، ان سے نکلتی ہوئی گرمی ابخارات کی طرح ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ ساری آوازیں اس پیڑ کی ڈالی ڈالی پر بیٹھی ہوئی بہت سی چیلوں کی طرح کبھی پاس کبھی دور، کبھی دور کبھی پاس ہوتی رہتیں۔ جلتی انگارہ آنکھوں سے کبھی سفید حدت، کبھی سیاہ کوئلہ نظر آتا۔ جو بھی چیز نظر میں آتی، دھواں دیتی ہوئے، گگروں کناروں سے جلتی ہوئی۔ سوائے آوازوں کے، جن کے کرارے پن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ایک آواز ابو تھی ایک آواز امی۔ ان کے علاوہ بہت ساری پیچھے کہیں دبکی ہوئی آوازیں، پیڑ کی بڑھتی ہوئی ڈالیوں کی طرح اگتی ہوئی۔ وہ ہوا کے ساتھ حرکت کرتیں تو ہوا ان کی باتیں مجھ تک لے آتی۔ میں بیماری کے عالم میں بھی پہچان سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں باتیں کر رہی تھیں وہ سرگوشیاں میرے بارے میں تھیں۔ مجھے ان کو نہیں سننا چاہیئے تھا۔ میری آنکھوں کی جلن اور بڑھ گئی۔ میں چور نیند میں سنی، ان سنی کرنے لگا۔

ان آوازوں میں وہ تھپکنے والی نرمی نہیں تھی۔ جس سے میں مانوس تھا۔ ان آوازوں نے اپنے آپ کو اس طرح ڈھالا ہوا تھا کہ میں ان سے اجنبی رہوں۔ یہ آوازیں میری پسینے سے بھیگی ہوئی جلتی ہتھیلیوں کی پہنچ سے ذرا ہی دور تھیں۔ اسی پلنگ پر۔

"اوں ہوں۔۔۔"

"شش، وہ جاگ جائے گا۔"

"تفم افس کنا تفو خفے یفال کفر فو۔ وفوہ بفیسمفار ہفے۔"

"وفوہ دفیکھ نفئیں سفکتفا۔"

آوازیں کبھی دور ہو جاتیں، کبھی پاس۔ مگر اب ان کے نام بھی تھے اور چہرے بھی۔ بخار سے جلتی ہوئی آنکھوں میں وہ کچھ کے کچھ، اور سے اور ہوتے جا رہے تھے۔ ابو پتلے ہو رہے تھے اور لمبے اور بجلی کی طرح ہنس رہے تھے۔ امی گول ہو رہی تھیں اور موٹی اور بادل کی طرح گرج رہی تھیں۔ ابو ایک بے باک ہوتا ہوا قہقہہ تھے۔ امی جھنجھلاتی ہوئی بے زاری تھیں۔ باقی سب کچھ خاموشی جو میرے حلق میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ میں چیخنا چاہتا تھا کہ بخار کا پیڑ مجھے

www.taemeernews.com

بھینچنے کے لیے بڑھا آ رہا ہے، مگر اس خیال سے گونگا ہو گیا تھا کہ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ میں جاگ رہا تھا تو۔۔۔۔ میرے پھنکتے ہوئے بدن پر کسی نے تمام برف کی پٹی مل دی۔ سر سے لے کر پیر تک جھرجھری دوڑ گئی۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں کو کانپ اٹھنے سے نہیں روک سکا۔ میرا بخار بجائے کم ہونے کے یک دم کئی درجے اوپر ہو گیا ہتھیلیاں جو پسینے میں بھیگ رہی تھیں، ٹھنڈی پڑ گئیں۔ آنکھوں کے پیچھے سیسہ بھرا ہوا تھا اور وہ کھولتا جا رہا تھا۔ ماتھا جل رہا تھا۔ کن پٹیوں میں دھمک ہو رہی تھا۔ میں نے آنکھیں اور زور سے میچ لیں۔ ان کی سوزش برداشت سے باہر تھی۔ آنکھوں میں جتنے رنگ تھے، سب جل کر راکھ ہو گئے۔ بخار اچانک پھر زور کرنے لگا۔ امی گھبرا کر ماتھے پر برف کی پٹیاں رکھنے لگیں۔ ابو گیلے کپڑے سے تلوے رگڑنے لگے۔ میں ہذیان بھری نیند میں بے سدھ ہو گیا۔

جب میری آنکھیں بغیر جلے ہوئے جسموں کو الگ الگ شناخت کرنے کے قابل ہوئیں تو اس وقت بھی ایک مریضانہ ملگجاہٹ طاری تھی۔ مگر اب میں فیصلہ کر سکتا تھا کہ یہ آنکھوں کا رنگ نہیں، شام کا رنگ تھا۔ آسمان پر بدرنگ جھٹ پٹا ہو رہا تھا۔ پیڑ کی ڈالیاں میں چڑیاں اکٹھا ہو رہی تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ امی دونوں ہاتھوں میں کچا گوشت لیے کھڑی تھیں۔

"دونوں وقت مل رہے ہیں، لب تو سنبھل جاؤ"۔ ان کی آواز میں التجا تھی۔ یہ آواز میرے لیے ہوتے ہوئے بھی میرے لیے نہ تھی۔

چار ہاتھ تھے جنھوں نے مجھے اٹھایا۔ سب باریک کپڑے کا کرتا میرے بدن پر ڈال دیا گیا جس میں سے ہوا گزر کر میرے جلتے ہوئے جسم کی گرمی کو اور بڑھا دیتی۔ پھر مجھے چادر میں لپیٹ کر مکان کی چھت پر لے جایا گیا جہاں عام دنوں میں کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہاں لکڑی کے تختے پڑے ہوئے تھے جو اس خیال سے ادھر ڈال دیے گئے تھے کہ کبھی ان سے کوئی چیز بنوائی جائے گی اور اس کی نوبت نہ آنے پائی، ان جانوروں کے دڑبے جنھیں پالا نہیں گیا، اور مکان کے باقی حصے کو تعمیر کرنے کے ارادے سے خریدی ہوئی ریت کی بوریاں جو بارش سے سخت ہو گئی تھیں۔ چھت کی منڈیر پر ایک چیل بیٹھی ہوئی تھی۔ امی کے پاؤں کی آہٹ پا کر وہ اڑ گئی۔ اس کے پروں کا رنگ میلی خورا تھا۔ میں نے منڈیر کو تھام لیا۔ ورنہ گر پڑتا۔ امی وہاں نہیں تھیں۔ چھجے پر سے ان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں: "ڈاکٹری علاج تو بہتیرا کر دیکھا۔ موافق آیا نہیں۔ بچہ ہے کہ بخار سے گھلتا جا رہا ہے۔" کوئی ان سے کہہ رہا تھا "اصل میں یہ بچہ مومنا چومنا بہت ہے۔ اس کو نظر ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر اتروا دو تبھی روز شام کو یہ بخار کا چکر پیچھا چھوڑے گا"۔ اس مرتبہ آواز میں سرگوشی نہیں تھی۔ میں نے آنکھیں پھر بھی میچ لیں کہ نہیں معلوم مجھے یہ سننا بھی چاہیے تھا۔ آنکھیں بند کر لیں تو ایک دندک بھری کال کوٹھری تھی جس کی دیواریں بخار کی گرمی سے تپ رہی تھیں۔ میں نے سنبھلنا چاہا تو تپش نے مجھے دھکیل دیا۔ میں

www.taemeernews.com

گرنے لگا۔

آنکھیں میں نے اس وقت کھولیں جب امی نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ گوشت کو دبائے ہوئے مٹھی سے میرا کھڑا قد ناپنے لگیں۔ وہ مٹھی میرے سر تک لے کر آتیں، پھر پیروں تک لے جاتیں۔ زیر لب وہ پڑھتی جارہی تھیں۔ میرے سارے بدن سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو پارہا تھا۔ میرے کندھوں پر پڑا ہوا باریک کرتا ہوا سے ہل رہا تھا۔ مٹھی میں دبانے سے کچا گوشت خون چھوڑنے لگا تھا اور بے خون ہو کر انگلیوں کی گرفت میں سفید ہو رہا تھا۔ میری پیشانی اور قدموں سے مس کرنے کے بعد امی نے وہ گوشت ایک طرف کو اچھال دیا۔ منڈیر پر چیل دوبارہ آگئی تھی۔

"یہ گوشت چیلوں کے لیے ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا تھا۔ امی کھانے کی چیزیں یوں تو کبھی نہیں پھینکتی تھیں۔

"تمہاری بیماری کی بلا ان کو لگ جائے"۔ امی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا، پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا: "نام نہیں لیتے ان کا۔ اوپر والی کہتے ہیں۔ شیطان کے کان بہرے۔ کہیں سن نہ لیں"۔ انہوں نے مجھے چادر میں ڈھانپ لیا اور گود میں اٹھا کر نیچے لے گئیں۔

اب کی بار میں فوراً نہیں سویا۔ میں آنکھیں کھولے جاگ رہا تھا جب امی چولہے میں لال مرچوں کی پڑیا جلا رہی تھیں جسے مجھ سے چھوایا گیا تھا۔ "دیکھو، نظر ہی تھی جو مرچیں جل رہی ہیں اور دھانس تک نہیں اٹھ رہی"۔ وہ ابو کو بتا رہی تھیں۔ ابو کی نظریں چولہے میں جلتی ہوئی مرچوں پر تھیں۔ "ورنہ آگ پر ذرا سی مرچ پڑ جائے تو وہ دھسک اٹھتی ہے کہ سارے گھر کے گلے میں خراش پڑنے لگتی ہے"۔ ان کی آواز اب مانوس تھی، اتنی مانوس کہ میرا گلا رندھ گیا۔

میں نے آنکھ اٹھائی تو چولہے کی آنچ تیز ہو کر اوپر اٹھ رہی تھی۔ وہاں سے ایسی سرخ بھبھو کا گرمی کی لپٹیں نکل رہی تھیں جیسے بخار میں بھنتا ہوا بدن۔ میں اس سے زیادہ نہیں دیکھ پایا۔ پھر اسی ہذیان بھری غشی نے مجھے آلیا۔

اب کی بار کھلی جو آنکھ تو مجھے خوب اچھی طرح یاد رہ گیا کہ میں نے کیا دیکھا۔ میرے سر پر روٹیوں کا تھال بندھا ہوا ہے اور چیلیں اسے نوچ نوچ کر کھا رہی ہیں۔ روٹی پر جھپٹا مارتی ہوئی چیل کا ملگجا، کھردرا، پردار بازو میرے چہرے سے ٹکرایا تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ جن کو اوپر والیاں کہتے ہیں یہ کب تک تاک لگائے رہیں گی، سر پر منڈلانا کب شروع کریں گی۔

۱۹۸۹ء

OOOOO

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

گائے کھائے گڑ

www.taemeernews.com

*

اس کی ایک ایک انگلی پر دعویٰ تھا۔ ایک نہ ایک نام کی پکڑ تھی۔ یہ اماں کی۔ یہ ببا کی۔ یہ بجیا کی۔ یہ بھیو کی۔ اور باقی بچا انگوٹھا۔ جو لچک لچک سب کے ساتھ سب سے الگ تھرک تھرک ناچتا تھا، جس کی پور پر سیاہی کی بندکی سے آنکھیں، ناک، منہ بناتے تھے۔ بہلانے کے لیے، ابھی سے اسے بہلانے کے لیے۔ تو انگوٹھا ہو گیا گائے کا کھونٹا۔ گائے کے کھونٹے کو دیکھا کہ جڑ مضبوط ہے، اوپر سے ہلتا ہے۔ اسے ہلا جلا کر دیکھنے والی دو انگلیاں پاؤں پاؤں چلتی ہوئی اس کی انگلیوں سے ہتھیلی کی کٹوری میں اتر آئیں، بس پھر شروع ہو جاتا گدگدی کا سفر۔ ہتھیلی سے بانہہ سے بازو سے مونڈھے سے سینے کی طرف۔ اچھا بچھیا دانہ کھاتی مم مم پیتی یہ چلی وہ چلی یہ آئی یہ آئی، جس کسی نے دیکھا ہو پکڑے پکل لے پکلے ..... ان پانچوں سے مل کر ایک پنجہ بھرے بھرے نرم نرم گوشت کو کھوجنے کھروچنے لگتا ہے، اور پنجے کے اٹھنے، مچلنے اور یورش کرنے سے پھدکتی ہوئی گدگدیاں ادل بدل کر ہنستی ہوئی کلکاریاں بنتی جاتی ہیں۔ بے کل ہنسی سے لوٹ پوٹ وہ اپنا بدن چھڑانے کی کوشش کرتا ہے مگر ان بہت ساری انگلیوں کے پاؤں سارے میں اچھیا بچھیا کو پکڑنے کے لیے دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں، اس کے ہاتھوں سے ہٹائے نہیں ہٹ رہے، اسے ہنسائے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس ہنسی کے بے بسی پر رونے لگتا ہے۔ تب انہیں بہلا کر چپ کرانے کا ایک موقع اور مل جاتا ہے۔ اس کو ہنسانا ان کے لیے کھیل بنا ہوا ہے۔ اچھا بچھیا اور انگوٹھے کا کھونٹا اور اب آئے گی ہنسی۔ ارے ارے رونے کی کیا بات ہے؟ آؤ پپی کرالو۔ نئیں کراؤ گے؟ اچھا تو چیاؤں میاؤں چیاؤں میاؤں کرتے ہیں۔

وہ اس کے ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔ اپنے ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تاکہ پھر اس سے اپنی مرضی پر چلا سکیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بندھ گئے ہیں۔ اور وہ گاتی ہوئی آواز میں اسے چیزوں کو پہچاننا اور الگ الگ کرنا سکھا رہے ہیں۔ بولو آٹا چھن چھن چھن، آٹا چھن چھن چھن۔ آٹا یاں رکھو (اس کا ہاتھ جھلا کر ایک طرف) بھوسی واں (وہی ہاتھ جھلا کر دوسری طرف)۔ اس دن وہ خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں جس دن اس کے ہاتھ اٹھتے ہیں اور اس سمت اپنے آپ حرکت کرتے ہیں جہاں سکھایا گیا تھا اور اس طرح کہ انہیں اس کے ہاتھ پکڑنے کی ضرورت بھی اب نہیں پڑتی۔

اب وہ اس سے آگے سبق کے لیے تیار ہے کہ ہاتھوں کے اسی مانوس لمس سے جسم کے باقیماندہ حصوں کو وابستہ کیا جائے۔ ہاتھ ان کو یوں پہچان جائیں کہ جوں ہی مقررہ لفظ ادا ہو، وہ خود بخود حرکت میں آجائیں۔ یہ کیا ہے؟ تتی۔ جے کا ہے؟ لپو۔ یہ ہاتھ یوں اٹھاؤ اور سر پر لے جاؤ، شاباش۔ جب ہاتھ سر پر لگے تو تتی۔ اور اب ایسے اٹھاؤ، ادھر گھماؤ، پیٹھ پر لگاؤ۔ جب پیٹھ پر

www.taemeernews.com

لگے تو لپو۔ اب تم خود کرو، تئی لپو تئی لپو دھم۔ دیکھا ناں کتا مجا آیا۔ تئی لپو تئی لپو اڑا اڑا دھم۔ واہ واہ، اب ایسے تالی بجاؤ۔ یوں دونوں ہاتھ جوڑ کر تالی بجاتے ہیں تتو تتو۔ واہ بھئی واہ، منا جیتا رہے، بڑا سا ہو جائے، تتو تتو۔

ایک بار تالی بجانا آ جائے تو زیادہ پیچیدہ ہدایت بھی دی جا سکتی ہیں۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ غور سے دیکھنا۔ پھر جو ہم کریں تو بھی اپنے ہاتھوں سے ویسا ہی کرنا۔ اچھا پہلے تالی بجاؤ۔ نہیں، تئی لپو نہیں۔ تالی، تتو تتو، ایسے۔ الفاظ ہم مہیا کریں گے، تم ان لفظوں کی ادائیگی کے ساتھ مقررہ عمل انجام دیتے جانا۔ ہم کہیں گے تاتی تاتی پوریاں، تم دونوں ہاتھوں سے پوریاں دکھاؤ۔ ہم کہیں گے گھیا چپوڑیاں، تم ہاتھ سیدھا کر کے دکھاؤ۔ میں کھاؤں میرا بالا کھائے۔ جلدی جلدی کھا کر دکھاؤ۔ جیسے ہاتھوں سے نوالہ بنا رہے ہو۔ دھر کان مڑوڑیاں۔ نہیں تم اپنے کانوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ کان مڑوڑ کے ہم دکھائیں گے۔ ٹھیک سے سمجھ گئے؟ چلو پھر کے سے شروع کرتے ہیں۔ تاتی تاتی پوریاں گھیا چپوڑیاں۔ میں کھاؤں میرا بالا کھائے۔ دھر کان مڑوڑیاں۔ اب جلدی سے منہ کھولو، نوالہ کھانے کے لیے جلدی جلدی، نہیں تو جہاز آ جائے گا۔ پھر تم شور سے ڈرو گے۔ جہاج آنا تو۔ کو کو ہاتھ لے جائے گی۔ آری کو کو جاری کو کو جنگل پکے بیر۔

کو کو جہاج کے ڈر سے مارے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے اور وہ ان کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا دیا ہوا نوالہ نگلنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ چھپنے کا موقع نہیں ملا تھا اور جہاج آ گیا تھا، وہ اوپر کی طرف سے چیختا گرجتا ہوا۔ اتنا ڈر لگا کہ رویا بھی نہیں گیا۔ سنسناتا ہوا ڈرا کیلا اکیلا اندھیرا بن گیا، اور وہ گم سم۔ عین اسی لمحے پتہ چلا کہ ہاتھوں میں چڑیاں ہیں۔ یہ والی انگلی چڑیا کی چونچ اور یہ چڑیا کے دو پاؤں۔ اس کا نام چنگا اور اس کا نام اوجی۔ جہاج آئے گا تو چنگا اوجی کو بلالوں گا، ان سے کھیلوں گا۔ جہاج آیا، چیا آنا تو۔

جس وقت میں نے اپنے ہاتھوں میں چڑیاں دریافت کیں، وہ ہاتھ بڑھنا شروع کر چکا تھا۔ ہاتھ شروع سے ہی بڑھ رہا تھا۔ اس وقت سے، جب دی جانے والی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ فوراً عمل کرتا تھا اور خوشی خوشی۔ یہ معلوم ہو جانے کے باوجود بھی کہ ان کے پورا کرنے میں دھوکا ہے۔ مجھے سکھلایا گیا تھا اور میں نے سیکھ لیا تھا کہ بار بار دھوکا کھانے کے اس عمل کو دہرائے جانا ہے۔

کہو گائے

.....دائے

گائے کا بچہ

.....دائے تا بتا

گائے کھائے

www.taemeernews.com

.....دائے تائے
گائے کھائے گڑ
.....دائے تائے گ گ.....

جو لفظ ادا کیا جانا تھا، مجھے معلوم تھا۔ لیکن لفظ کے ادا ہونے سے پہلے وہ ہاتھ بڑھا کر میرے نچلے ہونٹ کو چٹکی سے مسل دیتے۔ ادھورا لفظ ہونٹوں میں انکا رہ جاتا۔ ان کو ہنستا دیکھ کر میں بھی ہنس پڑتا۔ اپنی خفت بھول جاتا۔ وہ ہاتھ تاک میں لگا رہتا اور بار بار دہرائے جانے والے اس عمل کے تمام ہوتے ہوتے میں ہر بار اس سے زک اٹھاتا۔ میں کبھی نہیں سیکھ سکا کہ اس ہاتھ سے بچ سکوں۔ اس کے پکڑ میں آنے سے پہلے جملہ پورا کر دوں۔ اس لیے کہ وہ ہاتھ بہت لمبا تھا، اور بہت چوکس۔ میں اس کی پہنچ سے باہر نہیں نکل سکا۔ جہاز سے ڈر کر نوالہ حلق میں اتار لینے کے اتنے دنوں بعد بھی۔ وہ ہاتھ مجھ پر اب تک اٹھا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ جس ساعد سے جڑا ہوا ہے وہ بدن بدل جاتا ہے۔ نہیں بدلتا تو ہاتھوں کا یہ تعلق کہ ان کا ہاتھ دینے کے لیے اٹھا ہوا ہے اور میرا ہاتھ مانگنے کے لیے پھیلا ہوا۔ باقی سب کچھ اسی طرح برقرار ہے۔ میرا خوف۔ مردہ بھوک۔ میری جانب بڑھتا ہوا ہاتھ۔ اس ہاتھ کا نوالہ۔ اور میری بے زبان التجا کہ اس وقت تک نہ پکڑو میرے ہونٹ جب تک کہ میں یہ لفظ ادا نہ کر لوں۔ میری بے بسی پر ان کی ہنسی قائم ہے اور گائے کھائے چلی جا رہی ہے گو۔ ایک دفعہ بھی اسے نہ ملا گڑ۔

ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۹ء

OOOOOO

www.taemeernews.com

بیربَساون

www.taemeernews.com

اس وقت بھی وہ میری تھی جب مجھے معلوم تک نہیں تھا کہ یہ جنگ میری ہے۔ اس کشمکش میں جو داؤ پر لگا ہوا ہے، وہ میں ہوں۔ سر سے پیر تک دھات کی ایک سلاخ تھی جس میں سنسناہٹ بند ہوگئی تھی، اور اس کے بھاری بوجھ سے ہاتھ اینٹھے جارہے تھے، انگلیاں مڑنے لگی تھیں۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور قدم نہ جانے کیسے، کس سمت اٹھ رہے تھے۔ نعرے مارتے ہوئے شور کی یورش مجھے اپنی جانب کھینچے لے رہی تھی، جیسے میں اس کے بدن کا ٹوٹا ہوا حصہ ہوں، مجھے واپسی اسی میں لوٹ جانا ہے اور اسی جنگ کو لڑنا ہے جو تمہاری ہے..... کانوں میں ان کی سرگوشی گونج رہی ہے، میرے ذہن پر چھا گئی ہے: میری اپنی، میری جنگ!

اور جب پہلے پہل اس کا احساس ہوا تو ایک صدمہ بن کر مجھ پر پھٹ پڑا۔ گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔ میں تو جیسے بے حس و حرکت بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ چند ثانیے تک میری تو پلک بھی نہ جھپکی۔ ٹکٹکی باندھے ایک طرف تکے گیا۔ یہ تو مجھے جب احساس ہوا کہ کھڑکی کے شیشوں کے باہر دوسری گاڑیاں بدستور چل رہی ہیں، فٹ پاتھ پر اخبار فروش شام کی نئی سرخی گلا پھاڑ کر چلا رہا ہے، برقعے والی عورت سڑک پار کرنے کے لیے دو بچوں کا ہاتھ تھامے منتظر کھڑی ہے، ایک رکشہ گزر رہا ہے، ابھی ایک ٹرک گیا، لوگ موجود ہیں اور اسی طرح حرکت کر رہے ہیں جیسے ہر چیز ان کے لیے بالکل معمول کے مطابق ہو... میں دیکھے بغیر دیکھ رہا تھا۔ مگر اچانک اس منظر کی جزئیات مجھ پر بجلی بن کر گریں۔ تب میں سمجھا۔ اس وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ جو کچھ اخباروں میں دوسرے لوگوں کے بارے میں ایک خبر کے طور پر پڑھتا آیا تھا، وہ اس وقت میرے ساتھ بیت رہا ہے۔ اپنے ساتھ بیتنے کا یقین کرنا اس وقت بھی مشکل تھا۔ بہت مشکل۔ ایک ابرھا اعتبار آڑے آتا تھا کہ بھلا میرے ساتھ یہ سب کیسے ہوسکتا ہے: ہم ایسے لوگوں کے ساتھ ایسی باتیں نہیں ہوا کرتیں۔ یہ اعتبار اتنے آہستہ، سسک سسک کر مرتا ہے۔ اور یقین کی اس موت کے بعد کیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا اُمڈا آتا ہے۔ گھور اندھیرا، چکرا دینے والا خلا اور پیروں تلے کی زمین جیسے رلز لے سے ڈول رہی ہو، اور جب زمین کانپنے لگے، قدموں سے سرکی جائے تو پھر پناہ کہاں ہے؟ کہیں نہیں ہے! اب بھی لوگ یوں ہی موجود ہیں، سڑک پر گاڑیاں چل رہی ہیں، ہر چیز معمول کے مطابق ہو رہی ہے، میری گاڑی رکی ہوئی ہے اور انکشاف کا زہر میرے حواس میں قطرہ قطرہ اتر رہا ہے۔ میرے تن بدن میں ایک جھرجھری سی پھیل گئی اور پیٹھ پر اس احساس کے بعد چیونٹیاں سی رینگنے لگیں کہ وہاں پچھلی سیٹ پر سے ان کی آنکھیں اسی جانب لگی ہوئی ہیں۔ ان کی مداخلت، پھر وہاں موجودگی کا احساس پہلے کوفت اور پھر دہشت میں ڈھلنے لگا۔

www.taemeernews.com

ایک کھردرے ہاتھ کا لمس میرے گریبان پر تھا اور کسی سخت چیز کی گول ساخت دائیں پہلو میں پسلیوں کے اوپر ٹکی ہوئی تھی، ٹھنڈی، بے مہر، جیسے دائرے کا نشان، ثبت کر دینا چاہتی ہو۔ پہلے دائرہ، پھر سوراخ۔ اس ٹھنڈے، چبھتے ہوئے اور گول لمس نے مجھ پر واضح کر دیا کہ اب میں زد پر ہوں۔ اور نشانہ بننے والوں کے پاس اتنی سی بھی بھول چوک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہتر ہے کہ ان کی ہدایات کے مطابق اپنی بولتی بند رکھوں۔ حیرت اور خوف کا غلبہ ایسا تھا کہ کچھ نہ کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ ایک ہی خیال دماغ میں گردش کیے جارہا تھا: سو اب میری باری ہے! یہ جو اخباروں میں چھپتا آیا ہے، یہ اس طرح ہوتا ہے! اور جن کے ساتھ یہ ہوتا ہے ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے! اور اب میرے ساتھ ہو رہا ہے، میرے ساتھ.... کیا اس سے کچھ مدد ملے گی کہ میں انہیں بتا دوں کہ میں بھی کوئی ہوں؟ اس اندھیرے میں میرا نام ایک کوندے کی طرح لپکا۔ کچھ نام اور بھی تھے جو مدد کر سکتے تھے، جن کے سہارے اپنا آپ قائم کیا تھا۔ میں نے جس جگہ سے پڑھنا سیکھا اور جس دفتر میں ملازمت کرتا ہوں، ان کے نام اور نقشے میرے ذہن میں گھوم گئے، اور بہت سے شناسا چہرے بہتے ہوئے سامنے آئے۔ جیسے ڈوبتے ہوئے آدمی کے سامنے اس کی تمام گذشتہ زندگی ایک منظر کی طرح گھوم جاتی ہے..... کیا زندگی کی یہ تلخیص ڈوب کر مرنے کو آسان بنا دیتی ہے؟ یا یہ باور کرانے کے بعد، کہ یہ سب چھوڑنا کتنا مشکل ہے، شاید اسے ایک آخری اور انتہائی کوشش پر اکساتی ہے۔ میں نے چاہا کہ پکاروں اور پہچانا جاؤں اور واپس اپنی زندگی کے معمول میں لوٹ جاؤں، مگر پسلیوں کے پاس رکھی ہوئی پستول نے یاد دہانی کرا دی کہ میں زد پر ہوں۔ جس کشمکش میں مبتلا ہوں، وہ میری ہے۔ مجھے یہ لڑائی لڑنا ہے۔ آگ کے اس امتحان سے گزرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، وہ دوسرا دروازہ کھول کر میرے برابر والی سیٹ سے اتار لے گئے۔ میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ میرے ہاتھ دھرے رہے۔

اب تو یہ سوچنا بھی ناممکن ہے کہ اگلا قدم کیا اٹھاؤں۔ فوری ردعمل تو یہ تھا کہ گھر لوٹ جاؤں۔ لیکن گھر کا احساس بھی غیر محفوظ اور ناخوش گوار تھا۔ اگر انہوں نے گھر پر بھی قبضہ جما لیا ہوا تو.....؟ وہ مجھے اپنے ہی گھر میں گھسنے سے روک دیں گے۔ پھر کہاں جاؤں گا؟ مگر اس سے بھی زیادہ دہشت ناک تصور یہ تھا کہ اگر بالفرض انہوں نے کچھ بھی نہ کیا، اور گھر ویسے کا ویسا ہوا تب میرے ڈر کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو تو یہ ڈر سا کیوں لگے جاتا ہے؟ اگر ہر چیز معمول کے مطابق اسی طرح ہوئی جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا، تو پھر کیا ہوگا؟ میں وہاں اکیلا کس منہ سے داخل ہوں گا۔ کس کس کو بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور کیسے۔ جاننے والوں اور ملنے والوں کا سامنا کس طرح کر پاؤں گا؟ اس وقت پر آکر یہ شناسا چہرے اطمینان بخش نہ رہے۔ کسی پرانے ناٹک کے مکھوٹوں کی طرح استہزاء اور غیظ و غضب کے تاثرات میں ہمیشہ کے لیے

www.taemeernews.com

منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے پاس میرے لیے تصحیک کے سوا اور کیا ہوگا۔ اور میری مصیبت دیکھ کر ان کی اپنی خود اطمینانی کہ ہم تو بچ گئے، جو ہوا وہ اس غیر شخص پر بیتا۔ غیر شخص یعنی میں۔ اور میں اب اس سے گزر رہا ہوں، کھڑا سوچ رہا ہوں کہ کہاں جاؤں، کس کو بتاؤں، کیا کروں۔

اور بتاؤں بھی تو کیا؟ اس ابتلا سے گزرنے کی صدماتی کیفیت کے اندر نقصان کا ایک احساس اجاگر ہونے لگا۔ وہ چھین کر لے گئے۔ آنکھوں کے سامنے سے لے گئے۔ اسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دیکھتا رہا، اُف تک نہ کر سکا۔ سناٹے کا ایسا ریلا آیا کہ خاموشی کا بندھ ٹوٹ گیا اور وہ کچوکے دینے والی آوازیں مجھ پر کھل گئیں۔ میں جو پہلے ہی لٹا بیٹھا تھا، اب ان کی زد پر آگیا۔

"ناک کٹا آئے؟ اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"غیرت ہوتی تو سنکھیا پھانک کر کہیں پڑ رہتے۔"

"ایسی آفت کیا تھی گھر سے باہر نکلنے کی؟ بڑے چلے تھے ہوا کھانے کو۔ آخر منہ کی کھائی۔"

یہ تو سوچا ہوتا کہ شہر پہ پیمبری وقت پڑا ہے۔ ارے میاں یہ تو لشکر تاتار ہے!"

"بس بھیا، تم اپنی خیر مناؤ۔ جان بچ گئی۔ اب بیٹھ کر زخم چاٹو!"

کھوئے ہوؤں کو دوبارہ پالینا؟ میاں ہوش کے ناخن لو! کسی سے فریاد کرو گے، کس سے انصاف چاہو گے؟"

"پولیس رپورٹ؟ میاں ایسا غضب بھی نہ کرنا! آگے کے ہاتھ الٹے پیچھے آجائیں گے!"

تم کس برتے پر ان سے ٹکر لو گے؟ پودنے سے تو ہو!"

"اس کی نوبت تو آنی ہی تھی۔ میاں اللہ اللہ کرو۔ نویں پارے میں وہ سورۂ اعراف کی آیت ہے، اس کا ورد کرتے رہا کرو۔"

"اجی ہاں بس رہنے بھی دو، رہے نہ لینڈی کے لینڈی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کے بیٹھے رہے۔ تم کو تو تیار رہنا بھی گوارا نہ تھا۔ کتنا سمجھایا تھا کہ زمانہ نازک ہے، ہتھیار بند ہو کے رہو۔ پھر کیا مجال کہ کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے۔ ایک پستول تو پاس رکھا ہوتا، دیسی ساخت کا ہی لے لیتے، تو مردوں کی طرح لڑتے ہوئے مارے تو جاتے۔ بے غیرتوں کی طرح دیکھتے تو نہ رہتے کہ تمہاری بیوی کو اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔ اب رو سر پر ہاتھ دھر کے۔ تمہاری قسمت میں تو آنسو بہانا ہی لکھا ہے۔"

"اینٹ کا جواب پتھر سے دیا کرتے ہیں۔ مگر تمہیں جینے کے ڈھنگ نہ آئے۔"

"مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔ اب کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

www.taemeernews.com

کیا بہت دیر ہو چکی ہے؟ اب میں کیا کروں؟ کتابوں میں جو لکھا ہے وہ سچ ثابت ہو گیا کہ یہ معاشرہ میری مردانگی کے خلاف ایک سازش ہے؟ اس سازش سے محفوظ رہنے کے لیے کیا مجھ پر فرض ہو گیا کہ اسلحے کی زبان سیکھ لوں؟ کیا میں اپنی انگلیوں کو دھات کے اس جان لیوا لمس سے آشنا کرا سکتا ہوں؟ وقت پڑنے پر کیا میں کسی دوسرے آدمی کی جان لے سکتا ہوں؟ کیا میں اپنے آپ کو محاصرے میں سمجھوں اور جو ہاتھ میری جانب اٹھتا دکھائی دے، اسے سبب دریافت کیے بغیر، کاٹ ڈالنے کو تیار ہو جاؤں؟ میرے چہار جانب جو مخلوق خدا ہے اسے دشمن گردانوں اور غیر سمجھ کر اس کے قتل کے درپے ہو جاؤں؟ کیا میں قاتل بن کر نئی صبحوں کا آغاز کروں اور اپنے ظلم سے اس دھرتی پر قدم مضبوط جمالوں؟ کیا میری آنکھیں آہن پوش ہو چکی ہیں اور کیا میرے قلب پر مہر لگ گئی ہے؟ ان ہاتھوں سے تیغ و تلوار کیسے اٹھاؤں کہ جب جب اغیار خنجر آزما ہوئے، میں نے انہی ہاتھوں کی پناہ کر لی تھی؟ میرے اندر جو قرنوں پرانا وحشی ہے اسے تیغ بدست ہو جانے دوں؟ میں اپنے آپ کو درندہ تو نہ بننے دوں گا! کیا اس ظلم کے جواب میں بھی نہیں جو مجھ پر روا رکھا گیا ہے؟ اپنی فریاد کس کے پاس لے کر جاؤں؟ کس کے نام کی دہائی دوں؟ کیا میرے واسطے کہیں پناہ ہے، سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانہ؟ کیا میں عہد نامۂ عتیق کے بنی اسرائیل کی طرح سر پر خاک ڈالوں اور گریہ کروں؟ کیا میری نجات اس میں ہے کہ میں بھی اس کو اپنی جنگ سمجھ کر تلوار اٹھالوں؟ اگر میں سلاح شور نہ بن گیا تو کیا میرا زہرہ آب ہو جائے گا؟ ایلی ایلی لما شبقنی۔ خداوندا رحم کر۔ بار الٰہ آرام دے! اے کرشن، ان عزیز و اقربا کو دیکھ جو صف آراء ہیں اور جنگ کے مشتاق! میرے اعضاء نے جواب دے دیا ہے۔ میرا منہ خشک ہے۔ میرا جسم لرزتا ہے اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان ہاتھوں سے چھوٹی جاتی ہے۔ میرا بدن جل رہا ہے۔ پاؤں کانپتے ہیں۔ سر چکراتا ہے۔ کیشو! میں برے شگونوں کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے اپنے عزیزوں کی خوں ریزی میں کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ اے کرشن! نہ تو مجھے فتح کی ضرورت ہے نہ راج پاٹ کی نہ مسرت کی۔ اے گووند! سلطنت اور مسرت تو کیا، مجھے زندگی تک کی تمنا نہیں۔

دو طرفہ فوجیں چوکس کھڑی ہیں۔ ابھی گھمسان کا رن نہیں پڑا۔ کنتی کا بیٹا ارجن دو مسلح لشکروں کے درمیان غم زدہ کھڑا ہے۔ اس کا دل رنج سے معمور ہے۔ بھیشم ٹیلے پر کھڑا سنکھ بجا رہا ہے۔ فضا میں سنکھ، ڈھول، قرنے، نفیریاں اور گھونگھے گونج رہے ہیں۔ جنگی رتھ میں سفید گھوڑے جتے ہوئے ہیں۔ کورو اور پانڈو خاتمے کی لڑائی کے لیے تیار ہو کر رزم گاہ میں اترے ہیں۔ تیروں کی بارش بس ہونے کو ہے، پھر موت کا بازار گرم ہوگا۔ ارجن دھنش اٹھائے ہرشی کیش کے حضور دست بدعا ہے کہ اے اچیت، میری رتھ کو دونوں فوجوں کے درمیان لے چلیے کہ میں دیکھ سکوں کہ جنگ کرنے کے لیے کون کون آیا ہے اور جب جنگ شروع ہو جائے گی تو کون کون مجھ سے لڑے گا۔

www.taemeernews.com

تب پارتھ نے دیکھا کہ وہاں چچا، دادا، گرو، خسر، ماموں، بھائی، بیٹے، پوتے اور دوست جمع ہیں۔ تب اس نے کہا کہ انہیں قتل کرنے کی خواہش مجھ میں نہیں ہے۔ ہاں، میں خود قتل ہوسکتا ہوں۔ اے فنا کرنے والے جنارون ! ہمیں دھرت راشٹر کو قتل کر کے کیا خوشی حاصل ہوسکتی ہے۔ ان فراخ دل اور حریص بزرگوں کو قتل کر کے دولت اور خواہش کی خون آلود مسرت حاصل کرنے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ بھیک مانگ کر ٹکڑے کھاؤں۔ دھرت راشٹر کی وہ فوج ہمارے مقابل ہے جسے قتل کر کے ہم بھی زندہ نہیں رہنا چاہتے اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم فاتح ہوں یا ہمارے مخالف۔

ہاتھ ہتھیار تول رہے ہیں۔ کمانوں میں تیر چڑھ چکے۔ دونوں طرف سے تیاری پوری ہے۔ میں ارجن بنا دبدھے میں کھڑا ہوں۔ اور یہ کون ہے جو مجھ سے بھگوان کے لہجے میں کلام کر رہا ہے: "ارجن، میرے ارجن ....." دور سے وہ آواز میرے کان میں آتی ہے۔ وہ آواز کہتی ہے، یدھ کر۔

چنانچہ شری کرشن جی کی تعمیل میں، میں نے اپنے تئیں جنگ پر کمر کس لی اور دو سرکنڈے جوڑ کر گاڑی بنائی اور نکل کھڑا ہوا یدھ کرنے کو۔ دو سرکنڈوں کو جوڑ کر بنائی ایک گاڑی اور اس میں جوتے دو مینڈک اور چل پڑا، کہ دنیا میرا میدان کارزار ہے۔

چلم چل بھئی چلم چل۔ چلتے چلتے راستے میں ملی ایک چیونٹی۔ چیونٹی نے پوچھا: "میاں پودنے، کہاں چلے؟"

میں نے جواب دیا: "دو سرکنڈوں کی گاڑی بنائی۔ دو مینڈک جوتے جائیں۔ راجہ نے پکڑی پودنی۔ ہم بیر بساون جائیں۔"

چیونٹی نے کہا: "اے میاں پودنے ہم بھی آئیں؟"

پودنے نے کہا: "گھس گھس میرے کان میں گھس۔"

چیونٹی پودنے کے کان میں گھس کر بیٹھ گئی۔ اور ہم آگے چلے۔

چلم چل چلم چل۔ راجہ کا محل دور۔ پودنے کا غصہ تیز۔ مینڈک سرپٹ دوڑے جائیں۔ دو سرکنڈوں کی گاڑی ہلتی ڈولتی چلی جائے راجہ کے محل پر یلغار کرنے کو۔ راستے میں ایک ندی ملی۔ خشک ریت کی تہہ پر چاندی سی چمکتی، موج موج بڑھتی ندی لہراتی ہوئی آئی اور پودنے کے پاؤں پڑ گئی۔ ندی نے پوچھا:

"اے میاں پودنے، آج کہاں چڑھائی ہے؟"

میں نے جواب دیا: "دو سرکنڈوں کی گاڑی بنائی۔ دو مینڈک جوتے جائیں۔ راجہ ماری پودنی۔ ہم بیر بساون جائیں۔"

ندی نے کہا: "سنگ چلوں تو لے چلو گے؟"

www.taemeernews.com

پودنے نے کہا: "سس سس میرے کان میں گھس۔"

ندی پودنے کے کان میں گھس کر بیٹھ گئی۔ اور ہم آگے چلے۔

چلتے چلتے تھک گئے پاؤں۔ راجہ کا محل دور۔ بس چلتے ہی جانا ہے۔ چلم چل بھئی چلم چل۔ راجہ کا محل بھی آن پہنچا۔ پودنے میاں نے دو سر کنڈوں کی گاڑی روکی۔ راجہ کا محل اونچا۔ بڑے بڑے دروازے بند۔ چار طرف ناکہ بندی۔ جاؤں تو اندر کیسے جاؤں۔ راجہ کو للکاروں، اپنی پودنی کو چھڑا کر لاؤں۔ پودنے میاں نے اڑان بھری اور محل کے پھاٹک پر پہنچ کر چوٹ لگائی۔ محل کے پھاٹک لوہے کے پاٹ۔ صدائے بازگشت تک نہ ہوئی۔ پودنی قید میں، پھاٹک پر خاموشی کا قفل، پودنا بجنگ آمد پر عمل پیرا۔ چاہتا تھا کہ اپنا سر پھاٹک سے دے مارے۔ اس وقت تک وہاں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مگر اس بھیڑ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کے چہروں پر ایک مستقم صبر تھا اور موت ایسی خاموشی کہ وہ پودنے کو اتھاہ یاس میں پھڑ پھڑاتے دیکھتے تھے اور کچھ نہ کہتے تھے۔ چند ایک سامنے آئے اور خبردار کرنے کے انداز میں اشارے کرنے لگے کہ ایسا غضب نہ کرنا، راجہ کے قہر سے ڈرو۔ راجہ بال و پر نوچ کے پھنکوا دے گا۔ مگر پودنے میاں کے سر میں تو سودا سمایا ہوا ہے۔ وہ کب کسی کی بات مانتے ہیں۔ بڑے ساونت بنے ڈان کیہوٹے کی طرح ہوائی چکیوں سے مبارزت طلب ہو رہے ہیں۔ چوٹ پڑی، راجہ کے محل میں دستک ہوئی۔ محل کی فصیل کے اندر نیزوں کے اونچے اونچے پھل چمک رہے ہیں، گھڑ سوار دستے حرکت کر رہے ہیں۔ ان کے سموں سے گرد اڑتی ہے اور فصیل کے اوپر سے جھلکتی ہے۔

پودنا تیار ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ راجہ کی رعیت اس پر ترس کھائے۔ وہ جانتا ہے کہ محل کا مالک اس پر فرد جرم عائد کرے گا۔ وہ اپنے قتل کا محضر پڑھ رہا ہے۔ اس پر جرم درج ہے: "حویلی کے پھاٹک پر دستک۔" دستاویز میں اپنے جرم کی تفصیل اور اپنی سزا کی کیفیت کے بیان کے بعد پایان کار وہ کہتا ہے: "کیا اب میں زنداں کی فضا کے سوا کسی اور فضا کی تاب لا سکتا ہوں؟ اصل سوال یہی ہے۔ یا شاید ہوتا۔ بشرطیکہ مجھے اب بھی امید ہوتی کہ میں یہاں سے نکل سکوں گا۔" اس سے آگے مہر لگی ہوئی ہے۔

راجہ کے محل میں اطلاع ہو گئی۔

راجہ کے آرام میں خلل پڑا تو اس نے پوچھا: یہ کون گستاخ ہمارے دروازے پر چوٹ کر رہا ہے۔

دربان نے بتایا: "حضور، ایک پودنا آیا ہے۔"

راجہ نے کہا: "پوچھو کیا مانگتا ہے۔"

دربان نے پھاٹک پر ڈیرہ جمائے ہوئے پودنے سے کہا کہ راجہ نے پوچھا ہے تم کیا چاہتے ہو۔

www.taemeernews.com

میں نے جواب دیا: "راجہ سے کہو میری پودنی چھوڑ دے۔"

دربان نے اندر جا کر بتایا کہ حضور پودنا آیا ہے اور اپنی پودنی کو چھڑانا چاہتا ہے۔

راجہ یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا: "حقیر پودنا اور اس کی یہ مجال! اسے مرغیوں کے ٹاپے میں بند کر دو، ٹھونگیں مار مار کے صبح تک ادھ موا کر دیں گی۔ لے جاؤ اسے شاہی اصطبل میں قید کر دو، گھوڑے اسے لاتیں مار مار کے ختم کر دیں گے۔ لے جاؤ اسے اور پکڑ کر ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دو۔ رات بھر میں ہاتھی اسے روند کر قیمہ بنا ڈالے گا۔ بڑا آیا پودنی کو رہا کرانے والا!"

حکم کی دیر تھی، راجہ کے سپاہیوں نے سرکنڈوں کی گاڑی توڑ پھوڑ ڈالی اور پودنے کی مشکیں باندھ کر لے گئے۔

جب ہوئی آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر تو پودنے نے پکارا: "چھن چھن چھلنی چھل چھل چھاج، نکل بی چیونٹی تیرا ہی راج۔"

پودنے کی آواز سن کر چیونٹی اس کے کان میں سے نکلی اور ہاتھی کی سونڈ میں اس زور سے کاٹا کہ ہاتھی بلبلا کے مر گیا۔

صبح ہوئے تو راجہ نے سپاہیوں کو بھیجا کہ جاؤ پودنا مرا پڑا ہو گا اس کی لاش پھینک آؤ۔

راجہ کے سپاہیوں نے آ کر دیکھا کہ پودنا تو زندہ سلامت بیٹھا ہے اور راجہ کا ہاتھی مرا پڑا ہے۔

پودنا ہر بار بچ جاتا ہے۔ راجہ بار بار پودنے کی سزا اور زیادہ سخت کر دیتا ہے۔ پودنا اس فکر میں ہے کہ اس مہابھارت میں آخر اس کی بساط کیا ہے، اور میں تو اس آخری امتحان کا منتظر ہوں جب راجہ تھک ہار کے پودنے کو اپنے پلنگ کے پائے سے باندھ دے گا۔ اس رات میں ندی کو پکاروں گا:

"چھن چھن چھلنی چھل چھل چھاج، نکل بی ندی تیرا ہی راج۔" ایک بار ندی میں باڑھ آ جائے تو پھر نیا ڈانواں ڈول۔ میں راجہ کے محل میں ہاتھی کے پاؤں سے بندھا ہوا پودنا سہی۔ لیکن اپنی داستان کے اس موڑ تک آتے آتے جان گیا ہوں کہ پودنے کے کان میں خالہ بلی بھی ہے، چیونٹی بھی اور ندی بھی، اور کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوتی۔

۱۹۹۰

OOOOOO

www.taemeernews.com

آصف فرّخی

کے افسانوی سفر کا اگلا قدم

باطن

(چار طویل افسانے)

میں شاخ سے کیوں ٹوٹا

افسانے

زیرِ طبع

احسن مطبوعات۔ کراچی

مصنّف کی دوسری کتابیں

افسانے

آتش فشاں پر کھلے گلاب (۱۹۸۲ء)

اِسمِ اعظم کی تلاش (۱۹۸۴ء)

ترجمے

سدھارتھ از ہرمن ہیسے (۱۹۸۳ء)

تغلق از گرناڈ (۱۹۸۷ء)

ترانہ از آئین رینڈ (۱۹۸۷ء)

اِنٹرویوز

حرفِ من و تو (۱۹۸۹ء)

ترتیب

نوری نہ ناری ممتاز شیریں (۱۹۸۵ء)

ظلمتِ نیم روز ممتاز شیریں (۱۹۹۰ء)

محبت کے افسانے (۱۹۹۱ء)

زیرِ طبع

میں شاخ سے کیوں ٹوٹا افسانے

حرفِ ناگفتہ انٹرویوز

بھولی بسری کہانیاں مرتبہ

احسن مطبوعات
کراچی ۔ پاکستان